جلد (۸) عدد (۱)
محرم الحرام ۱۳۵۵ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ)
قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی نہیں بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت غیر مجلد (للعہ) سکہ انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت صہ سکہ انگریزی عہ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ محرم ۱۳۵۵ھ - جلد ۸ - عدد (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

ترجمان القرآن کی اشاعت کو اب پورے تین سال گذر چکے ہیں۔ اور محرم ۵۵ھ سے اس کی زندگی کا چوتھا سال شروع ہو رہا ہے۔ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے جو انعامات ہوئے ہیں ان کا شکر بجا لانا میرا پہلا فرض ہے۔ اول تو یہی احسان کیا کم ہے کہ ایک حقیر گنہگار بندے کو دین حق کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا گیا، حالانکہ اگر انتخاب کا مدار علم، تقویٰ، اخلاص اور کمالات ظاہری و باطنی پر ہوتا تو شاید میں آخری شخص ہوتا جس کی طرف نگہ انتخاب مائل ہوتی۔ پھر اس پر مزید احسان یہ ہے کہ میری تمام کوتاہیوں کی تلافی اپنے فضل و انعام سے کی گئی۔ بے علم تھا، تو علم عطا کیا گیا، ناواقف راہ تھا، راہ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی۔ کمزور اور پست ہمت تھا، صبر و ثبات اور استقامت کی توفیق دی گئی۔ بے سر و سامان اور بے یار و مددگار تھا، خزانۂ غیب سے ہر ہر قدم پر سر و سامان بہم پہنچایا گیا، اور ہر مشکل کو ایسے ایسے طریقوں سے آسان کیا گیا کہ میری فکر و تدبیر کا اس میں کچھ بھی دخل نہ تھا۔ یہ تو وہ احسانات ہیں جن کو میں جانتا ہوں، اور ان کا بھی پورا پورا شکر ادا کرنا میری قدرت

سے باہر ہے۔ رہے وہ بے شمار احسانات جن کی مجھ کو خبر تک نہیں، تو ان کا شکر کیسے بجا لاؤں۔ بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

مگر حق تعالیٰ اپنے فضل و احسان میں جیسا فیاض ہے، یہ بندہ اس سے فضل و احسان کی طلب میں ویسا ہی حریص ہے۔ اس نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر ضرور ہے مگر قناعت نہیں۔ خدا کے مقابلہ میں قناعت کیسی؟ اس کو اپنے غنا پر ناز ہے تو بندے کو بھی اپنے فقر پر ناز ہے۔ اس کا فیض بے پایاں ہے تو بندے کی احتیاج بھی بے پایاں ہے۔ وہ دینے سے نہیں تھکتا تو بندہ مانگنے سے کیوں تھکے؟ اور اس سے نہ مانگے تو پھر کس سے مانگے؟ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس پیاس کو بجھانے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ میری عقل و فہم میں ہزاروں کوتاہیاں ہیں اور ان کو دور کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ میرا دل بے چین ہے، میری روح مضطرب ہے، میرا دماغ سکون سے محروم ہے، خدا ہی ہے جو اس بیماری کا مداوا کر سکتا ہے۔ میں گناہوں میں گھرا ہوا ہوں، میرے عمل میں لاکھوں خامیاں ہیں، میری فطرت کی کمزوریاں قدم قدم پر مرضاتِ الٰہی کے اتباع سے مجھکو روکتی ہیں۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو میرے ان عیوب کی اصلاح کرے اور عمل صالح کی توفیق بخشے۔ میں اس سے خلوصِ نیت کا طلب گار ہوں، صحتِ فکر اور سدادِ نظر مانگتا ہوں۔ الحب فی اللہ و البغض للہ کی توفیق چاہتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بندوں سے بے نیاز کر کے صرف اپنا نیازمند بنائے، محبت اور خوف اور طمع کا تعلق سب سے توڑ کر صرف اپنے ساتھ جوڑ دے، اور اپنی قوت و طاقت عطا فرمائے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنے دل کے سب حوصلے نکال سکوں۔ وَاَدْعُوْ رَبِّیْ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا۔

ماہ گذشتہ میں میری صحت کی خرابی اس حد تک پہنچ گئی کہ مجبوراً رسالہ کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ اگرچہ یہ التواء مجھ کو بھی ناگوار ہوا، اور ترجمان القرآن کے ان ناظرین کو بھی ناگوار ہوا ہوگا جو گہری دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ اشاعت روکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ رسالہ جس معیار پر مرتب کیا جا رہا ہے اس کو برقرار رکھنا اور جو مقصد اس کے پیش نظر ہے اس کو پورا کرنا ایک تنہا انسان کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اہل علم اور اہل درد اصحاب کی ایک اچھی خاصی جماعت مسائل کی تحقیق اور مضامین کی تحریر میں مدد دینے والی ہو۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ جماعت تو درکنار، ایک شخص بھی مستقل طور پر میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ کمی اشاعت کی وجہ سے رسالہ کی مالی حالت ایسی نہیں کہ کوئی مددگار رکھا جا سکے اور بدقسمتی سے رسالے کے قلمی معاونین کا حلقہ بھی تنگ ہے۔ تنہا میری ذات پر رسالہ کی ادارت کا پورا بار پڑ گیا ہے۔ مسلسل تین سال سے اس محنت شاقہ کو برداشت کر رہا ہوں، اور اس مدت میں ایک دن بھی مجھ کو آرام نصیب نہیں ہوا ہے۔ ایک انسان زیادہ سے زیادہ جتنا کام کر سکتا ہے، وہ اب تک میں نے کیا اور انشاء اللہ آئندہ بھی کروں گا، مگر اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے دل اور دماغ کی تمام قوتیں جواب دے رہی ہیں۔ گذشتہ مہینہ یہ کیفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مجبوراً مجھ کو بالکل کام چھوڑ دینا پڑا۔ اب پھر اپنے اندر کچھ قوت پاتا ہوں، اور اللہ کی مدد کے بھروسہ پر کام شروع کر دیا ہے۔ اگر بارگاہ خداوندی میں یہ کام مقبول ہے تو یقیناً اس کو جاری رکھنے کے لیے وہیں سے کوئی انتظام ہو جائے گا۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ۔ وَاِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۝

پچھلے دنوں تبدیل آب و ہوا کے لیے بیدر اور اس کے نواحی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ شہر تقریباً دو سو برس تک اسلامی تمدن و تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ بڑے بڑے علماء، صلحاء، سپہ سالار

اور مدبرین دولت اس کی خاک میں مدفون ہیں۔ میلوں تک اُن آثار کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو اب بھی اپنے بنانے والوں کی عظمت پر شہادت دے رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ اسلاف کی عظمت رفتہ اینٹ و پتھر کی صورتوں میں زندہ اور انسانی شکلوں میں مردہ ہے۔ جن ناموروں نے اس سرزمین میں اپنی شوکت وحشمت کے یہ زندہ آثار چھوڑے ہیں۔ ان کی جسمانی یادگاریں اب بھی وہاں موجود ہیں، مگر ان میں زندگی نہیں۔ ان کے علوم وفنون مرگئے، ان کے کمالات مرگئے، ان کے دل مرگئے، ان کی روحوں پر مردنی چھاگئی۔ اس قدیم اسلامی بستی میں آنکھوں نے تلاش کیا کہ کوئی عالم نظر آئے، کوئی باخدا بزرگ ملے، کوئی فنون قدیمہ کا ماہر دکھائی دے کوئی ایسا باکمال انسان ملے جس کے وجود کو دیکھ کر کم ازکم دل کو یہ دھوکہ ہی دیا جاسکے کہ اسلامی تہذیب و تمدن میں ابھی کچھ زندگی باقی ہے، لیکن ہر جستجو میں نگاہیں ناکام ہوئیں، اور دل نے گواہی دی کہ اسی کو قوموں کی موت کہتے ہیں۔

ہندوستان کی سرزمین کا کونسا چپہ ہے جس پر مسلمانوں نے اپنی بزرگی کے نقوش نہیں چھوڑے تھے مگر وہ مرگئے اور اپنے ساتھ اپنی بزرگی کو بھی لے گئے۔ اب ہماری بستیوں کو دیکھئے تو خون اور گوشت کے چلتے پھرتے مجسمے لاکھوں نظر آئیں گے، مگر اہل کمال مفقود، اہل دل ناپید، نظم ملت پراگندہ، روح ملت افسردہ۔ کہیں اگر دور سے کچھ نظر فریب چمک دمک نظر آتی بھی ہے، تو قریب جاکر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنا کمال نہیں محض دوسروں کے کمالات کا عکس ہے، اور عکس لینے میں بھی اپنی بے کمالی نمایاں ہورہی ہے۔

یہ دیکھکر البتہ خوشی ہوئی کہ حیدر آباد میں بعض افراد اپنی قوم کی اس پستی کا احساس رکھتے ہیں اور مردوں میں زندگی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔

اس گئی گذری حالت میں بھی شاید مسلمانوں کی کوئی بستی ایسی نہ ہو گی جس میں کم از کم دو چار دردمند دل نہ پائے جاتے ہوں۔ بڑے شہروں کی حالت تو بظاہر مایوس کن ہے لیکن چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں ایسے لوگوں کے لیے کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ اگر ایک ایک بستی میں ایک بھی سچا درد رکھنے والا مسلمان عملی جد و جہد کے لیے کمربستہ ہو جائے تو مسلمانوں میں نظم اور نظم میں حیات پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام نے تو ہمارے کام کو بہت ہی ہلکا کر دیا ہے ہمیں صرف دو چیزوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، ایک اقامت صلوٰۃ۔ دوسرے ایتائے زکوٰۃ۔ اسلام کے یہ دو ارکان مضبوطی کے ساتھ قائم کر دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ پراگندہ افراد خود جماعت بنتے ہیں، جماعت میں خود بخود زندگی کی حرکت پیدا ہوتی ہے، حرکت آپ سے آپ قوت پیدا کرتی ہے، اور قوت بالطبع ترقی کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔ پراگندگی بے سروسامانی اور اخلاقی و روحانی انحطاط کی کوئی حالت اس حالت سے بڑھ کر متصور نہیں ہو سکتی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں پائی جاتی تھی۔ مگر وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ان تمام کمزوریوں کو دور کر کے عرب کو ایک طاقتور قوم بنا دیا؟ یہی دو چیزیں۔ انہی پر قرآن میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انہی کو قائم کرنے پر نبی اکرم اور صحابہ کرام نے سب سے زیادہ اپنی قوت صرف کی انہی دونوں پر اسلامی عظمت کی عالمگیر عمارت قائم ہوئی یہی وہ ارکان ہیں جن کا انہدام اسلام کا انہدام ہے۔ عہد رسالت اور عہد صحابہ پر نظر کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں اسلام اور اقامت صلوٰۃ لازم و ملزوم تھے اور کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان تارک الصلوٰۃ ہو۔ ایتائے زکوٰۃ کی اہمیت کا یہ حال تھا کہ سرکار رسالت مآب کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے اس رکن اسلام کو منہدم کرنا چاہا، ان پر صدیق اکبر نے تلوار کھینچ لی اور اس طرح ان سے جنگ کی جیسے کفار سے کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ کس لیے تھا؟ محض اس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ کے مٹ جانے کے بعد اسلام کا عدم و وجود

برابر ہوجاتا ہے ایمان کا شعلہ بجھنے لگتا ہے۔ اخلاق فاسد ہوجاتے ہیں، جماعت کا شیرازہ منتشر ہوجاتا ہے، باہمی تعاون کا رشتہ منقطع ہوجاتا ہے، اور آخرکار امت کی حالت وہ ہوجاتی ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پس جو لوگ حقیقت میں اسلامی جمعیت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں انہیں کسی نئے پروگرام کی ضرورت ہی نہیں۔ اسلام کی فطرت سے جو جمعیت مناسبت رکھتی ہے، اس کے لیے صحیح ماڈل نہ تو نازی او فاسسٹی ہے اور نہ خاکساری و خدائی خدمتگاری بلکہ اس کا صحیح ماڈل وہی مدنی و محمدی ہے، اور اس کے لیے صرف اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کا پروگرام کافی ہے۔

ایک مہلک مرض جو مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو گھن کی طرح کھا گیا ہے، اور کھائے جا رہا ہے "وراثت" کا مرض ہے۔ سب سے پہلے اس نے ہمارے نظام سیاست کو خراب کیا۔ اس کے بعد یہ گھاس تلے کے پانی کی طرح ہمارے نظم ملت کے ہر شعبے کی جڑوں میں پھیلتا چلا گیا اور ہماری قوت کے جتنے مرکز تھے ان سب کو اس نے فاسد کردیا۔ اسلام میں تو نبی کا بیٹا بھی وراثت میں نبوت نہیں پاتا مگر یہاں وراثت کا قانون ایسا عالمگیر ہوا ہے کہ عالم کا بیٹا عالم ہے، مرشد کا بیٹا مرشد، قاضی کا بیٹا قاضی، امام کا بیٹا امام اور سپہ سالار کا بیٹا سپہ سالار۔ ہر شخص جس نے اپنے علم فضل و کمال سے جماعت میں اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کیا، اس کی ایک باقاعدہ مسند بن گئی، اور اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں کا اس مسند پر بیٹھنا لازم ٹھیر گیا، خواہ ان میں اہلیت ہو یا نہ ہو۔ وراثت کے اس غلط اور جاہلانہ طریقے نے اتنا زور پکڑا کہ جوہر کمال بے قیمت ہوگیا اور اکثر و بیشتر دینی و اجتماعی خدمات جن کی بجا آوری پر تمام ملت کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے، محض نسبی استحقاق کی بنا پر نا قابل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ علماء کا اصلی کام علم حق کا پھیلانا تھا۔ مگر جب علم کے خانوادے بن گئے تو

علمائے حق کے بے علم جانشینوں نے جہالت کی تاریکی پھیلائی اور مسلمانوں کو گمراہ کر دیا۔ مرشدوں کا اصلی منصب تزکیہ نفوس اور فضائل اخلاق کی اشاعت اور خلق اللہ کی ہدایت تھا، مگر جب مسند ارشاد ورثہ میں منتقل ہونے لگی تو ارشاد غائب ہوگیا، اور اس مسند کے وارثوں کا کام صرف یہ رہ گیا کہ دست و پا کو بوسے دلوائیں، مریدوں، معتقدوں اور زائروں سے نذرانے وصول کریں، اور استخواں فروشی سے جو مال حاصل ہو اس کو فسق و فجور کی نذر کر دیں۔ قضاۃ اس لیے تھے کہ شریعت کی حدود قائم کریں، مگر جب منصب قضا مال و جائداد کی طرح باپوں سے بیٹوں کو ترکے میں ملنا شروع ہوا تو قاضیوں کا کام یہ ہوگیا کہ بزرگوں کی معاشوں سے داد عیش دیں اور اقامت حدود کے لیے سعی کرنا تو درکنار، خود اپنے کرتوتوں سے شریعت کی ایک ایک حد کو توڑ ڈالیں یہی انجام دوسرے اہم مناصب کا بھی ہوا۔ مساجد کو مسلمانوں کی آبادیوں میں جو مرکزیت حاصل تھی وہ نالائق اماموں اور متولیوں کے ہاتھوں قریب قریب فنا ہوگئی۔ اوقاف اسلامی جو کبھی خیرات و حسنات کے منابع تھے، اسی منحوس وراثت کی بدولت تباہ ہوگئے۔ اسلام کا عسکری نظام جس کی ہیبت و جبروت سے روئے زمین کانپ اٹھتا تھا۔ اسی وجہ سے غارت ہوا کہ امارت و قیادت کے اہم مناصب خاندانوں کی میراث بن گئے۔ غرض اسلامی تہذیب و تمدن کو اس چیز سے جتنے شدید نقصانات پہنچے اور پہنچ رہے ہیں۔ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدھر نظر کی جاتی ہے، دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے بڑے بڑے وسائل پر ایسے لوگ قابض پائے جاتے ہیں جو خود فساد کے سرچشمے اور مفاسد کی پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ اس سد راہ کو پوری قوت کے ساتھ اکھاڑ نہ پھینکا جائے۔

آخری دور کے بادشاہوں اور امراء و حکام نے کچھ تساہل، کچھ ناعاقبت اندیشی اور

کھیجا فیاضی کی بنا پر یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علماء، مشائخ، قضاۃ، ائمہ اور دوسرے اہل مناصب کے لیے جاگیریں اور معاشیں مقرر کیں اور ان مناصب کو موروثی بنا دیا اُس دور کے عام مسلمان بھی فقدان علم اور عدم تدبّر کی وجہ سے اسی غلطی میں مبتلا ہوئے اور اپنی عقیدتوں کو باکمال بزرگوں کے بعد ان کے بے کمال جانشینوں کی طرف منتقل کرتے چلے گئے۔ اس کے بُرے نتائج کو انہوں نے نہ سمجھا، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن آج وہ نتائج بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص شریعت یا رسم و رواج کی آڑ لیکر اس غلط قاعدے کی حمایت کرتا ہے تو اس کی عقل پہ ہزار افسوس ہے رواج کی آڑ تو مسلمانوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے اصل اور بودی آڑ ہے۔ کوئی غلطی محض اس بنا پر برقرار رہنے کی مستحق نہیں ہوسکتی اس کا ارتکاب سو دو سو یا ہزار برس پہلے کیا گیا تھا۔ رہی شریعت تو اُسکی نگاہ میں ہر چیز سے زیادہ اہم اور اقدم دین کی مصلحت اور امت کی بہتری ہے۔ اگر شرعی قانون کے مطابق کوئی فعل کیا گیا ہو اور بعد میں ثابت ہو جائے کہ وہ فعل مصلحت دینی کے خلاف اور جماعت کے لیے مضر تھا تو اس فعل کے جاری رکھنے کے لیے یہ کوئی محکم دلیل نہیں ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وہ فعل شرعی قانون کے مطابق کیا گیا تھا۔ خود شرعی قانون ہی اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایسے فعل کو مٹا دیا جائے۔

ناظرین ترجمان القرآن اس سے باخبر ہیں کہ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی آجکل انگریزی زبان میں قرآن مجید کا با تفسیر ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے ان کو لین (Lane) کی مشہور انگریزی لغت (Arabic English Lexicon) کی ضرورت ہے اگر کوئی صاحب اس کتاب کو فروخت کرنا چاہیں تو مولنا سے دریاباد ضلع بارہ بنکی کے پتہ پر مراسلت فرمائیں۔

مقالات

مسئلہ بداء

علم کلام کا ایک تشنۂ تحقیق جزیہ

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی کا صلہ
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

(۱)

بدار سے کیا مراد ہے؟ سید شریف جرجانی فرماتے ہیں۔

البداء ظھور الرای بعد ان لم یکن — بدار یہ ہے کہ پہلے ارادہ نہ تھا، رای نہ تھی، بعد کو یہ صورت ظاہر ہوئی۔

والبدائیۃ ھم الذین جوّزوا البداء علی اللہ تعالیٰ — جو لوگ اللہ تعالیٰ سے بدار کو منسوب کرتے ہیں وہی "بدائیۃ" ہیں[1]

شرح مواقف میں ہے:۔

فرقہ بدائیۃ | البدائیۃ جوّزوا البداء — بدائیہ اللہ تعالیٰ پر بدار کو تجویز کرتے ہیں، تجویز کی

[1] ۔ تعریفات؛ طبع ۱۳۱۸ء۔ استانبول۔ ص ۲۹۔

علی اللہ تعالیٰ ای جوّز وان یرید اللہ شیئًا ثم یبدو لہ ای یظھر علیہ ما لم یکن ظاھرًا علیہ ویلزمہ ان لا یکون الرب عالمًا بعواقب الامور[1]

صورت یہ قرار دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی شی چاہتا ہے، پھر اس خواہش کے خلاف کوئی مصلحت ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا اس کو ترک کر دیتا ہے اس عقیدہ کے لوازم میں یہ ہے کہ پروردگار انجام کار سے لاعلم ہو[1]

علم کلام کا یہ جزئیہ بالکل ہی تشنۂ تحقیق ہے، آئیے تاریخ سے اس کی تشریح کرائیں۔

———— (۲) ————

مابعد شہید کربلا ہجرت نبوی کا چھیاسٹواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشت کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، جوش انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے، یزید و آل یزید پر عام بیزاری مزید ہے، توابین کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر تہ و بالا اب بھی برپا ہے اسی حالت میں قبیلۂ ثقیف کا ایک جوانمرد اٹھتا ہے اور سب کو بٹھا دیتا ہے، اس کی کنیت ابو اسحاق ہے، پہلے خارجی رہ چکا ہے۔ اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ طرفداران اہل بیتؑ میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے باایں ہمہ شیعہ اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسنؑ مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے یہ کانٹا کیا گل کھلاتا ہے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے۔

کانت الشیعۃ تسبّہ وتعیبہ لما کان منہ فی امر الحسن بن علی حین طعن فی ساباط وحمل الی ابیض المدائن[2]

سیدنا حسن بن علی علیہما السلام کے معاملہ میں جب کہ ساباط میں نیزہ مارا گیا اور مداین کسریٰ کے قصر سفید میں اٹھا کر پہونچایا گیا اس شخص کی جو روش رہ چکی تھی اسی بنا پر شیعہ اس کو گالیاں دیتے اور اس پر طرح طرح کے عیب لگاتے تھے[2]۔

---

[1] شرح مواقف - طبع ۲۵ ۱۳ مطبعۂ سعادۃ - مصر - ج ۸، ص ۳۸۸ [2] ابن الکامل طبع ۱۳۰۱ - ازہریہ مصر ج ۴، ص ۸۳

۳

خلافت ابن زبیر | دمشق میں یزید کا خاتمہ ہو چکا تھا' معاویہ بن یزید کے دن پورے ہو چکے تھے' سال بھر ہوئے مروان بھی مر چکا تھا اور عبدالملک کو چھوڑ گیا تھا کہ "مرج راہط" کے نتائج سے نفع اٹھائے' حجاز و یمن و مصر کے ساتھ عراق نے بھی عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت تسلیم کر لی تھی۔

اسی حالت میں یہ جوانمرد عراق آتا ہے' بیگانہ وار کوفہ کا رخ کرتا ہے' اور جاننا چاہتا ہے کہ آیا اُس کے لیے بھی کوئی میدان ہے؟ ہانی بن جبۃ الوداعی سے ملاقات ہوتی ہے جو اسے بتاتا ہے۔

روزن دیوار | اهل الكوفة على طاعة ابن الزبير، الا ان طائفة من الناس هم عدد اهلها لو كان لهم من يجمعهم على رأيهم اكل بهم الارض۔

کوفہ کے لوگ عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کے مطیع ہیں البتہ ایک چھوٹا سا فریق اور ہے کہ ان سب میں یہی لوگ شمار و قطار میں لانے کے قابل ہیں کوئی انہیں سمیٹ کے یکرائے بنا دے تو انہیں کے سہارے تمام زمین کو کھا جائے

ہمارا جوانمرد یہ سن کے بے اختیار ہو جاتا ہے کہ:-

ذریعہ فتح یاب | انا ابو اسحاق - انا والله لهم ان اجمعهم على الحق والقى بهم ركبان الباطل، وا هلك بهم كل جبار عنيد[1]

میں ہوں ابو اسحٰق' میں ہی ان کے لیے ہوں اُن کو امر حق پر اکٹھا کروں گا' ان کے ذریعہ باطل پسندوں سے لڑوں گا۔ اور ہر ایک سرکش جبّار کو ہلاک کروں گا[1]

---

[1] الکامل۔ ج ۴ ص ۲۴۳۔

رفتار روزگار نے یہ الفاظ حرف بحرف صحیح ثابت کیے، قاتلان حسین علیہ السلام سے اُس کا انتقام نہایت خون ریز تھا۔

(۴)

فریب بمقابل فریب | انہیں معرکوں میں ایک مرتبہ ایک پرکالۂ آتش بھی گرفتار ہوا کہ سراقہ بن مرداس بارقی کے نام سے معروف عام تھا، قیدیوں کو عموماً قتل کی سزا دی جاتی تھی لیکن یہ تو بارقی تھا، تلوار کی بجلی ایسے برق وش پر کیا گرتی، قتل کے لیے پیش ہوا تو یہ کہنے لگا۔

فرشتہ نمائی | اصلح الله الامیر احلف بالله الذی لا اله الا هو لقد رأیت الملائکة تقاتل معك علی الخیول البلق بین السماء والارض

صاحب کو اللہ تعالیٰ صلاحیت کے ساتھ رکھے میں اُس خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ آسمان و زمین کے درمیان ابلق گھوڑوں پر سوار تیری جانب سے لڑ رہے ہیں

حکم ہوا:۔

اصعد المنبر فاعلم الناس۔　　منبر پر چڑھ کے اپنے مشاہدات سے لوگوں کو آگاہ کر دے

عوام یہ باتیں سن کے قدرۃً خوش ہوئے ہوں گے کہ اس لڑائی میں اللہ ہمارا مددگار ہے ہمارا زمانہ شناس جوانمرد اتنا سادہ دل نہ تھا کہ ان باتوں میں آجاتا، تاہم مصلحت مقتضی تھی کہ اُس کو رہا کر دیا جائے۔

(۵)

افشائے راز | یہ بجلی آزاد ہو کے بصرہ پہونچی اور مصعب کے لشکرگاہ سے یہ شرارے چھوڑے:۔

الا ابلغ ابا اسحاق انی　　رأیت البلق دُهماً مُصمتات

(ابو اسحاق کو خبر دو کہ جو ابلق گھوڑے میں نے دیکھے تھے سچ مچ کے ابلق نہ تھے وہ تو نرے کالے رنگ کے مشکی تھے)

أُرِی عینیّ ما لم تبصراہٗ　　کلانا عارفٌ بالتُّرھاتِ

(میں اپنی آنکھوں کو ایسی چیزیں دکھاتا ہوں جو دیکھی تک نہیں، ہم تم دونوں باطل شناس ہیں)

کفرتُ بوحیکم وجعلت نذراً　　علیَّ قتالکم حتی المماتِ[1]

(تم پر جو وحی آتی ہے میں اس کا منکر ہوں اس وحی کے فریبوں میں نے منت مان رکھی ہے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے کہ مرتے دم تک تم لوگوں سے لڑتا رہوں گا)۔

ادعائے نزول وحی | آخری بیت سے کچھ محسوس ہوتا ہے کہ عوام میں چرچا تھا کہ ہمارے جوانمرد پر وحی نازل ہوتی ہے یہ سخن سازی ہی تھی یا اس میں واقعیت کا بھی کچھ شائبہ تھا؟

عربوں کی شاعری سے جو آگاہ ہیں آجکل کی عجمی خیال بندی پر اس کو قیاس نہیں کرسکتے اس کی تحقیق کے لیے بھی آپ کو تاریخ ہی کی عدالت میں رجوع کرنا پڑیگا۔

بیا کہ پردہ ز روئے خوش تو بر دارم

(۶)

عمارت وحی کی کرسی | کوفہ میں طفیل بن جعدہ بن ہبیرہ کے دن بڑی تنگی و ترشی سے بسر ہورہے تھے، نزولت مال حوادث کی تلوار سے نڈھال کہ مال ہی نہیں پھر کون پوچھتا ہے کمال۔

پڑوس میں ایک تیلی صاحب کی دوکان پر ایک میلی کچیلی کرسی پڑی رہتی طفیل نے اسکو اٹھا منگایا گھر میں صاف کرایا، لکڑی تیل پی چکی تھی نہایت روغن دار نکلی، دربار میں جاکے اطلاع دی کہ

ان فیہ اثراً من علیٍّ　　اس کرسی میں علی علیہ السلام کی نشانی ہے۔

حکم ہوا:-

سبحان اللہ اخرتہ الی ھذا الوقت ابعثہ　　اللہ اللہ اب تک اس کی اطلاع نہ دی ابھی منگا۔

---

[1] الکامل صفحہ ۱۱

کرسی حاضر کی گئی، بارہ ہزار انعام ملا، اجتماع عام ہوا، اور خطابت نے اپنی شان دکھائی!

لم یکن فی الامم الخالیة امر الا و هو کائن فی هذه الامة مثله و انه کان فی بنی اسرائیل التابوت و ان هذا فینا مثل التابوت۔	تابوت سکینہ کا نمونہ — گذشتہ قوموں کا کوئی ایسا امر نہیں کہ ویسا ہی اس امت میں شدنی نہ ہو، بنی اسرائیل میں تابوت سکینہ تھا، ہماری امت میں یہ کرسی اسی تابوت کے مماثل ہے؛

اللہ اکبر کے نعروں میں کرسی پر سے غلاف اتار اگیا اور اب اس کی عظمت مسلم ہوگئی۔

ابن زیاد سے حسین علیہ السلام کے خون کا بدلہ لینے کے لیے جب لشکر چلا ہے تو ایک خچر پر آگے آگے یہ کرسی بھی ایک غلاف کے اندر تھی۔

فقتل اهل الشام مقتلة عظیمة فزادهم ذالك فتنة فارتفعوا حتی تعاطوا الکفر	لشکر نے شامیوں پر بڑا کشت و خون کیا، کامیابی نے فتنہ کو اور بڑھا دیا، کرسی کے متعلق جو عقیدہ تھا اب اس سے بھی بڑھے، اور اس قدر بڑھے کہ کفر کرنے لگے۔

—————— (۷) ——————

چھوٹے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر — یہی موقع تھا جب اعشیٰ ہمدان کو کہنا پڑا:—

شهدت علیکم انکم سبائیة — و انی بکم یا شرطة الشرك عارف

(تمہارے خلاف میں گواہی دیتا ہوں کہ تم سبا بن سبا یہودی کے فرقہ کے لوگ ہو، شرک کے پولس والو، فی الواقع تم کو میں اچھی طرح جانتا ہوں)

فاقسم ما کرسیکم بسکینة — و ان کان قد لفت علیه اللفائف

(قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری کرسی پر غلاف تو چڑھے ہوئے ہیں، بایں ہمہ وہ تابوت سکینہ نہیں ہے)

وأن لیس کالتابوت فینا وان سعت شبامٌ حوالیہِ وتہدٌ وخارفٌ

(میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ اگرچہ اس کرسی کے اردگرد شبام ور نہدا و رخارف دوڑتے رہتے ہیں، پھر بھی وہ تابوت سکینہ کے مانند نہیں)۔

وانی امرئٌ احببت اٰل محمّد وتابعت وحیاً ضمنتہُ المصاحفُ

(میں ایسا شخص ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت رکھتا ہوں اور اسی وحی الٰہی کا تابع ہوں جو قرآن شریف میں ہے)۔

وبایعتُ عبداللہ لما تتابعت علیہ قریشٌ شمطہا والغطارفُ

اہل بیت سے محبت رکھتے ہوئے میں نے عبداللہ بن الزبیرؓ سے بیعت کر لی اس لیے کہ قریش کے جتنے فرقے ہیں اور جس قدر سرداران قوم ہیں سب نے ان کی خلافت پر اتفاق کر لیا)۔

کرسی کے پجاری | اس نظم کی تیسری بیت کی تشریح بھی سن لیجئے۔

خرجت شبامٌ وشاکرٌ ودوس	شبام اور شاکر اور دوسرے سرداران قوم اس
اصحابہٖ وقد جعلوا علیہ الحریر وکان	کرسی کی بزرگداشت کو نکلے، اس پر ریشمی غلاف چڑھا
اول من سدنہ موسی الاشعریؒ	رکھا تھا، پہلے پہل موسیٰ اشعری اس کرسی کے خادم
فعتب الناس علےٰ موسیٰ فترکہ و	مقرر ہوئے لوگوں نے جب ملامت کی تو موسیٰ نے
سدنہ حوشب البرسمی۔	یہ خدمت ترک کر دی پھر خدمت حوشب برسمی کے تفویض ہوئی

کرسی اور وحی کا پایہ | چوتھی بیت کی نسبت "لیثی" کی شہادت پر غور کیجئے۔

ابلغ ابا اسحاق ان جئتہ انی بکرسیکمو کافر

(ابو اسحاق کے پاس جانا تو یہ پیغام سنانا کہ تم لوگوں نے جو کرسی بنا رکھی ہے میں اس کا منکر ہوں)۔

تروا اشیام حول اعوادہ　　　وتحمل الوحی لہ شاکر

(تم دیکھو گے کہ کرسی کی لکڑیوں کے ارد گرد شبام پھر رہا ہے اور شاکر اس کے لیے حامل وحی کا کام کر رہا ہے)

محمرۃ اعینھم حولہ　　　کانھن الحامض الخاثر

(کرسی کے گرد یہ لوگ کھڑے ہیں، آنکھیں لال لال ہیں، ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بھینگے اور تنگ چشم ہیں)

فرقہ مختاریہ | یہ مختار بن ابی عبید ثقفی تھا جس کی کنیت ابو اسحاق تھی اور جس نے سید نا حسین علیہ السلام کے قاتلوں سے بڑا سخت انتقام لیا ہے، مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں اس کا بھی ایک فرقہ ہے جسے "مختاریہ" کہتے ہیں۔

فرق الشیعہ | جرمن مستشرقوں کی نامور مجلس نے "نشریات اسلامیہ" کے سلسلہ میں استامبول کے مطبعۃ الدولہ (یعنی سرکاری مطبع) سے ۱۹۳۱ میں "کتاب فرق الشیعہ" شائع کی ہے جو سلسلہ نشریات کی چوتھی یادگار رہے، ڈاکٹر ھ ریتر اس کے ناشر ہیں، سید ہبتہ اللہ شہرستانی نے کہ علماء شیعۂ اہل بیت علیہم السلام میں ممتاز شہرت رکھتے ہیں، اشاعت کتاب میں امداد فرمائی ہے اور متند مصنفات امامیہ اثنا عشریہ سے مصنف کے واقعات حیات یکجا کئے ہیں۔

علامۂ نوبختی | عہد خلافت عباسیہ میں خاندان نوبخت بہت ہی نکھا اور نکلا، یہ لوگ مجوسی تھے مسلمان ہو کے علم ہیئات میں شہرۂ آفاق ہوئے، حسن بن موسیٰ نوبختی اسی شیعی خاندان کے رکن رکین تھے جنہیں علماء شیعہ نہایت ثقہ مانتے ہیں اور اپنے علم کلام کا علامہ جانتے ہیں، شیخ حلی خلاصہ میں اُن کو اپنا شیخ لکھتے ہیں۔ (ص ۲۱) ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی المتوفی ۴۶۱ کی کتاب الفہرست طبع کلکتہ ۸۵۳ میں ہے کان امامیاً حسن الاعتقاد ثقۃ (وہ طریقہ شیعہ امامیہ کے خوش اعتقاد ثقہ و قابل اعتماد بزرگ تھے) ان کی شان میں وارد ہے (ص ۹۶) شہید ثالث قاضی سید نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں "از اکابر این طائفہ و عظمائے این سلالہ" ان کو قرار دیتے ہیں (طبع تبریز

ص۱۲۴ تاریخ فرق الشیعہ انھیں علامہ نوبختی کی کتاب ہے ۔

(۹)

اس کتاب میں مختار بن ابی عبید ثقفی اور اس کی جماعت کے اعتقادات دیکھنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں ۔

[امام مہدی اور وصی] قالت ان محمد بن الحنفیۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ ھو الامام المھدی وھو وصی علی بن ابی طالب علیہ السلام	اس فرقہ کا قول ہے کہ محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ ہی امام مہدی آخر الزماں ہیں اور انہیں کو امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنا وصی مقرر فرمایا تھا
[اہل بیت ان کے تابع ہیں] لیس لاحد من اھل بیتہ ان یخالفہ ولا یخرج عن امامتہ ولا یشھر سیفہ الا باذنہ	اہل بیت میں کسی کو حق نہیں کہ اُن کی مخالفت کر سکے نہ ان کی امامت سے کوئی سرتابی کر سکتا ہے، اور نہ بدون ان کی اجازت کے تلوار کھینچ سکتا ہے ۔
[حسن علیہ السلام محکوم تھے] وانما خرج الحسن بن علی الی معاویۃ محاربًا لہ باذن محمد و وادعہ وصالحہ باذنہ ۔	محمد بن حنفیہ ہی کی اجازت سے سیدنا حسن علیہ السلام معاویہ سے لڑنے کو نکلے تھے اور پھر اُنھیں کے حسب حکم مصالحت کی تھی ۔
[حسین علیہ السلام بھی محکوم تھے] وان الحسین انما خرج لقتال یزید باذنہ	سیدنا حسین علیہ السلام بھی یزید سے لڑنے کی غرض سے محمد بن حنفیہ ہی کے حکم سے برآمد ہوئے تھے
[ہلاکت و ضلالت] ولو خرجا بغیر اذنہ ھلکا وضلا ۔	حسنین علیہما السلام اگر محمد بن حنفیہ کی اجازت سے نہ نکلتے تو ہلاک و گمراہ ہو جاتے
[کفر و شرک] وان من خالف محمد بن الحنفیہ کافر مشرک ۔	جس نے محمد بن حنفیہ کی مخالفت کی وہ کافر بھی ہے اور مشرک بھی ۔
[اختیار بدست مختار] وان محمدًا استعمل المختار بن ابی عبید علی العراقین بعد	شہادت حسین علیہ السلام کے بعد محمد بن حنفیہ نے مختار بن ابی عبید کو عراقین یعنے بصرہ و کوفہ کا والی

قتل الحسين وامره بالطلب بدم الحسين وثاره وقتل قاتليه وطلبهم حيث كانوا۔ وسماه كيسان لكيسه ولما عرف من قيامه ومذهبه فيهم

و کارفرما مقرر کرکے حکم دیا کہ شہید کربلا کے خون کا انتقام لیں، ان کے قاتلوں کو قتل کریں، اور جہاں کہیں ملیں انھیں ڈھونڈھ نکالیں۔ مختار کی دانشمندی وکیاست کی بنا پر محمد بن حنفیہ نے "کیسان" کے خطاب سے اُن کو مخاطب کیا، جانتے تھے کہ وہ کتنے بڑے مستعد ہیں اور دشمنان خاندان نبوت کے متعلق اُن کی روش کیا ہے۔

فرقہ مختاریہ

فهم يسمون المختارية ويدعون الكيسانية[1]

اسی بنا پر یہ فرقہ مختاریہ کے نام سے موسوم اور کیسانیہ کے خطاب سے مشہور ہے[1]۔

(۱۰)

شہرستانی کی "ملل ونحل" ۱۸۴۶ء میں ریورنڈ کورتن نے ایڈٹ کی تھی جو ۱۹۲۳ء میں لیبزک سے شائع ہوئی، اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:۔

مختار پہلے خارجی تھا

المختارية اصحاب المختار بن عبيد كان خارجيًا ثم صار زبيريًا ثم صار شيعيًا وكيسانيًا، قال بامامة محمد بن الحنفية بعد علي وقيل لا بل بعد الحسن والحسين و كان يدعوا الناس اليه ويظهر انه من رجاله ودعاته ويذكر علومًا مزخرفة ينوطها به۔

مختار بن عبید کے فرقہ کا نام مختاریہ ہے، یہ شخص خارجی تھا، پھر عبداللہ بن زبیرؓ کا پیرو بنا، پھر شیعی ہو گیا اور شیعہ کیسانیہ کا عقیدہ اختیار کیا، علی علیہ السلام کے بعد محمد بن حنفیہ کو امام برحق مانا، مختار کے عقیدہ کی نسبت دو روایتیں ہیں، ایک روایت ہے کہ علی علیہ السلام کے بعد ان کے تیسرے فرزند محمد بن حنفیہ کی امامت کا معتقد تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ نہیں علی علیہ السلام کے بعد حسنین علیہم السلام کو اور ان کے

[1] فرق الشیعہ ص ۲۴۔

بعد محمد بن حنفیہ کو امام معصوم کہتا تھا، ان کی امامت کا داعی تھا ان کے لوگوں میں اپنے آپ کو جتاتا، ان کے داعیوں میں اپنے تئیں قرار دیتا کچھ مزخرف علوم کا تذکرہ کرتا کہ یہ محمد بن حنفیہ کے علوم ہیں۔

امام کی تبری اپنے مقتدی سے

ولما وقف محمد بن الحنفیہ علی ذلك تبرأ منه و اظهر لاصحابه انه انما نمس علی الخلق ذلك لیتمشی امره و یجتمع الناس علیه۔

محمد بن حنفیہ واقف ہوئے تو انہوں نے مختار سے برات کی اور اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دیا کہ خلق اللہ کو مختار نے محض اس لیے فریب دیا ہے کہ اُس کا کام چل نکلے اور سب اُس پر اتفاق کریں۔

کامیابی کے اسباب

وانما انتظم لهٗ ما انتظم بامرین۔

اس کو جتنی کامیابی ہوئی دو سبب سے ہوی

احدهما انتسابه الی محمد بن الحنفیة علماً و دعوةً۔

ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو محمد ابن الحنفیہ سے منسوب کرتا تھا کہ میں اُن کے علم کا حامل اور ان کی امامت کا داعی ہوں۔

والثانی قیامهٗ بثار الحسین علیه السلام و اشتغاله لیلاً و نهاراً بقتل الظلمة الذین اجتمعوا علی قتل الحسین

اور دوسرا سبب یہ ہوا کہ وہ حسین علیہ السلام کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کھڑا ہوا اور شب و روز ان ظالموں کو سزا دینے میں سرگرم رہا جو حسین علیہ السلام کے قتل پر مجتمع ہوئے تھے۔

مختار کا مذہب

فمن مذهب المختار انه یجوز البداء علی الله تعالی

مختار کے مذہب کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ پر "بدا" کی تجویز کرتا ہے۔

والبداء له معانٍ۔

"بدا" کے کئی معنی ہیں۔

متن	ترجمہ
بدا فی العلم | البدا فی العلم	ایک تو وہ بدا ہے جو علم میں ہو۔
وھو ان یظھر لہ خلاف ما علم۔	"بدا فی العلم" یہ ہے کہ پہلے جو معلوم ہوا تھا اب اس کے خلاف ظاہر ہوا
ولا اظن عاقلا یعتقد ھذا	یہ بات میرے گمان میں بھی نہیں آتی کہ کوئی عقلمند اس عقیدہ
الاعتقاد۔	رکھتا ہو۔
بدا فی الارادہ | والبدا فی الارادۃ۔	دوسرا وہ "بدا" ہے جو ارادہ میں ہو۔
وھو ان یظھر لہ صواب علی خلاف	"بدا فی الارادۃ" یہ ہے کہ پہلے جو ارادہ اور فیصلہ
ما اراد وحکم۔	کیا تھا اب اس کا مخالف پہلو درست نکلے۔
بدا فی الامر | والبدا فی الامر	تیسرا وہ "بدا" ہے جو امر (حکم) میں ہو
وھو ان یامر بشیء ثم یامر بعدہ	"بدا فی الامر" یہ ہے کہ کسی شے کی نسبت پہلے کوئی حکم
بخلاف ذلک۔	دیا تھا، پھر اس کے مخالف کوئی حکم دیں۔
مینہ سے بچا، پرنالے کے نیچے | ومن لم یجوز النسخ	کلام اللہ میں جو ناسخ و منسوخ کو ناجائز قرار دیتے
ظن ان الاوامر المختلفۃ فی الاوقات	وہ یہی گمان کرتے ہیں کہ مختلف اوقات میں مختلف احکام
المختلفۃ متناسخۃ۔	ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مٹا ڈالتا ہے
راز درون پردہ | وانما سار المختار الی	بدا کا عقیدہ اختیار کرنے کی علت یہ تھی کہ مختار کو
اختیار القول بالبدا لانہ کان یدعی	دعویٰ تھا کہ جو حالات اس وقت پیش آ رہے ہیں یا
علم ما یحدث من الاحوال۔	آیندہ چل کے پیش آنے والے ہیں مجھے ان سب کا علم ہے
اما بوحی یوحی الیہ۔	یہ علم یا تو وحی الہی کے ذریعے سے ہے جو مجھ پر نازل ہوتی ہے
واما برسالۃ من قبل الامام۔	یا امام کے پیغام سے یہ علم حاصل ہوا ہے۔
فکان اذا وعد اصحابہ بکون شیء	اپنے ساتھیوں سے جب کسی شے کے ہونے یا کوئی حادثہ

وحدوث حادثۃٍ فان وافق کونہ قولہ جعلہ دلیلاً علی صدق دعواہ۔

پیش آنے کا وعدہ یا وعید کرتا تھا تو واقعات اگر اسی کے قول کے مطابق پیش آتے تو اپنے دعوے کے سچ ہونے کی دلیل قرار دیتا۔

وان لم یوافق [بدی کے مانے بدا کے سہارے] قال: قد بدا لربکم۔

لیکن اگر اس کے کہنے کے موافق نہ ہوتا تو کہتا تمہارے پرور دگار نے بدا کر لیا" یعنی پہلے جو کرنا چاہتا تھا جب ظاہر ہوا کہ وہ خلاف مصلحت تھا تو اس سے رجوع کر لیا۔ اور اس کے مخالف کام کیا جو مصلحت کے مطابق تھا۔

وکان لایفرق بین النسخ والبدا۔

یہ شخص نسخ اور بدا دونوں کو ایک کہتا تھا اور ان میں کوئی تفریق نہیں کرتا تھا۔

قال: اذا جاز النسخ فی الاحکام جاز البدا فی الاخبار[۱]۔

اس کا قول تھا کہ احکام میں جب نسخ جائز ہے تو خبروں میں بدا بھی جائز ہے۔

یہ ہے بدا جس کی توضیح کے لیے آیندہ اشاعت کا انتظار فرمائیے۔

از جلوہ بیارام دے کایں ہمہ سامان
در حوصلۂ دیدہ بیکبار نگنجد

---

[۱] کتاب الملل والنحل ص ۱۰۹ - ۱۱۲

حجاب اور بے حجابی

از

زعیم اسلام امیر شکیب ارسلان

مترجمہ جناب حکیم سید محمد شعیب صاحب

چند سال ہوئے عالم اسلامی کے مشہور لیڈر امیر شکیب ارسلان کا ایک مضمون مصر و شام اور دوسرے ممالک کے عربی اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں خواتین اسلام کی تعلیم اور ان کی آزادی کے حدود پر صحیح اسلامی نقطۂ نظر بیان کیا گیا تھا معلوم نہیں کہ ہندوستان تک بھی وہ پہنچا یا نہیں۔ میں نے نیویارک کے جریدہ "البیان" سے اس مضمون کا اقتباس کیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ترجمان القرآن دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ امیر شکیب ارسلان کی رائے کسی دقیانوسی خیال پرانے ملّا کی رائے سمجھ کر نظر انداز نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس کو یورپ کی سیاحت اور یورپین تہذیب کے مطالعہ اور اساطین تہذیب مغربی کے ساتھ مبادلۂ خیال کے اتنے مواقع ملے ہیں جتنے شاذ ہی۔ ہندوستان، ایران، مصر اور ٹرکی کے کسی شخص کو ملے ہوں گے اور اس کے ساتھ یہ بھی بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق کے بہت کم لوگوں کی نظر موجودہ زمانے کے عمرانی و سیاسی مسائل میں اتنی گہری ہوگی جتنی امیر موصوف کی ہے۔ (محمد شعیب)

اب سے تقریباً تین سال پہلے کا واقعہ ہے کہ جرمنی میں زندگی بہت سستی ہوگئی تھی۔ ایک طالب علم وہاں کے کالجوں میں دو یا تین گنی ماہوار پر آسانی گذر کر سکتا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائد

اٹھایا، اور اپنے وطن شام و فلسطین کے باشندوں کو توجہ دلائی کہ اس وقت جرمنی میں زندگی خود ہمارے ملک سے زیادہ ارزاں ہے لہٰذا جو لوگ تنگ دستی کی وجہ سے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلا سکتے ان کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو جرمنی بھیج دیں، تاکہ وہاں کم سے کم خرچ پر جس کا اس زمانہ میں تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ ان کو زمانہ حال کی بہترین تعلیم حاصل ہو جائے۔ میرا یہ مضمون قدس شریف کے جریدہ "الصباح" میں شائع ہوا، اور اس کے اثر سے تقریباً ۰۴ طالب علم برلین، لائپزگ، کونستانزا اور دوسرے مقامات کی یونیورسٹیوں میں تحصیل علوم کے لیے پہنچ گئے۔ اس زمانہ میں جرمنی کی تعلیم اور وہاں کی زندگی کے متعلق جزئی معلومات فراہم کرنے کے لیے مجھ پر سوالات کی اتنی بوچھار ہوئی کہ میں جواب دیتے دیتے عاجز آ گیا۔ آخر کار میں نے برلن میں ایک خاص مجلس اس غرض کے لیے قائم کر دی کہ لوگوں کو اس باب میں ضروری معلومات بہم پہنچائے۔

اس سلسلہ میں جن لوگوں نے مغربی تعلیم کے مسئلہ پر مجھ سے استفسارات کیے ان میں ایک صاحب فلسطین کے اکابر میں سے بھی تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ جرمنی میں میرے دو بچے تعلیم پا رہے ہیں ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی ہے۔ لڑکے کی عمر ۸ برس کی ہے اور وہ "جمنازیوم" نامی مدرسہ میں داخل ہے۔ لڑکی ۱۲ سال کی ہے اور وہ وہاں کے ایک زنانہ مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔ صاحب خط نے مجھ سے ان دونوں بچوں کی تعلیم کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ان دونوں کو وہیں تکمیل تعلیم تک رہنے دیا جائے یا وطن واپس بلا کر بقیہ تعلیم مکمل کرائی جائے۔ خصوصاً لڑکی کے مسئلہ میں وہ زیادہ متردد تھے، کیونکہ وہ سن رشد کے قریب پہنچ گئی تھی۔

میں نے ان کو جواب دیا کہ لڑکے کو وہاں تکمیل تعلیم کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کی عربی تعلیم کا بھی کافی انتظام ہو، کیونکہ جو عرب لڑکا بچپن سے عربی تعلیم حاصل نہ کرے اور جس کو بچپن سے اپنے عرب ہونے کا احساس نہ دلایا جائے، وہ خواہ تعلیم کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج تک کیوں نہ پہنچ

جائے، اس کا شمار ہمارے شجر تہذیب کی صالح شاخوں میں نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ایک ٹہنی ہے جو ہمارے درخت سے کٹ گئی اور ایک دوسری کیاری میں بو دی گئی۔ اب وہ ہم سے نہیں ہے اور ہمارے لیے اس کا وجود کچھ بھی مفید نہیں۔ رہا لڑکی کا معاملہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا جواب دوں، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ اس باب میں آپ کا مشرب خاص کیا ہے، اور مسئلہ ایسا ہے جس کا تعلق ہر شخص کے اپنے مشرب سے ہے۔ آپ کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ بچی کو اب جرمنی سے بلا کر باقی تعلیم قدس شریف میں دلائیں، جہاں مجھ کو یقین ہے کہ اس کی تعلیم کے لیے کافی انتظام موجود ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے جرمنی میں رہنے دیں تاکہ وہ ایک اچھی جرمن لڑکی کی طرح اپنی تعلیم پوری کر کے نکلے۔ لیکن پہلی صورت میں آپ اپنی لڑکی کو بعض یوروپین زبانوں اور علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور اسلامی عقیدہ کی تعلیم بھی دلوا سکیں گے اور وہ ایک مسلمان لڑکی بن کر نکلے گی۔ اور دوسری صورت میں وہ بعض یورپین زبانیں اور جدید علوم تو ضرور سیکھ لے گی، مگر صرف نام کی مسلمان ہوگی اور محض عرف عام کے لحاظ سے اس کو عربیہ کہا جا سکے گا۔ پہلی صورت میں آپ کی بیٹی آپ ہی کی بیٹی رہے گی اور مسلمان کے سوا کسی کی بیوی نہ بنیگی۔ دوسری صورت میں وہ اگر چاہے گی تو آپ کی بیٹی رہے گی اور اگر نہ چاہے گی تو آپ کسی معاملہ میں اس کے ارادہ کو نہ روک سکینگے، اور آپ کے لیے کسی وقت یہ خبر سننا خلاف توقع نہ ہوگا کہ آپ کی صاحبزادی، فلاں جرمن نوجوان کے دام محبت میں گرفتار ہو گئیں اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا، حتٰی کہ یہ سن کر بھی آپ کو اچنبھا کرنے کا حق نہ ہوگا کہ اس نے ایک یہودی نوجوان سے محبت کی اور اپنی زندگی کو اس کے ساتھ منسلک کر دیا۔ پس آپ خود ہی اپنے لیے دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار فرما لیجئے چونکہ میں اس مسئلہ میں آپ کے مشرب خاص سے واقف نہیں اور نہ آپ کے رجحان قلب کا حال مجھ کو معلوم ہے، اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں سے کونسی صورت آپ کو پسند ہے اور کس صورت کے اختیار کرنے سے آپ کو درد سر لاحق ہوگا۔ آپ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیں کہ میں آپ کو یہ صورت یا وہ صورت اختیار کرنے

کا مشورہ دیرہا ہوں، یا آپ کے لیے ایک صورت کو دوسری صورت پر ترجیح دیرہا ہوں میں نے کوئی بات اس معنی میں نہیں کہی۔ میرے کلام کا مقصود صرف یہ ہے کہ اگر آپ اس بات کو برداشت کرنے کی قدرت اپنے اندر نہیں پاتے کہ آپ کی صاحبزادی ہیٹ اور اسکرٹ پہن کر نکلے اور جو نوجوان اس کو پسند آئے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر چلے اور جس سے چاہے خلا ملا پیدا کرے۔ خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اور وہ سب کچھ کرے جو آج مسلمانوں میں جدید ہے، تو آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آج ہی اس کو جرمنی سے واپس بلالیں قبل اس کے کہ اس کی واپسی کے امکانات کم ہوجائیں، کیونکہ کچھ مدت اور گذر جانے کے بعد اس کی خواہشات کے مرکز سے اس کو پھیر دینا آپ کی قدرت سے باہر ہوجائیگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ یقیناً کسی غیر مسلم سے شادی کرے گی اور حتماً جس جوان کو پسند کرے گی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدےگی۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اس کے ایسا کرنے کا امکان ہے، اور اگر وہ ایسا کرنا چاہے گی تو آپ اس کو نہ روک سکیں گے لیکن اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ایک جرمن یا کوئی اور یورپین کرسکتا ہے، وہی ایک مسلمان بھی کرسکتا ہے، وہ بھی بشر ہے اور ہم بھی بشر ہیں جب ایک یورپین عورت کے لیے اپنے والدین کی رضامندی سے یا بلارضامندی ایک مسلمان کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے تو ایک مسلمان عورت کے لیے بھی ایک یورپین یا یہودی یا چینی یا بودھ یا ہندو سے رشتہ جوڑنا جائز ہونا چاہیے خواہ والدین راضی ہوں یا نہوں، تو اس مشرب کے لحاظ سے میں آپ سے کہونگا کہ اس کو جرمنی میں تکمیل تعلیم کرلینے دیجیے۔

پس مسئلہ دراصل رجحان اور نظر کا ہے، جو شخص اِس طرف رجحان رکھتا ہے اس کے لئے یہ طریقہ ہے، اور جو اُس طرف رجحان رکھتا ہے اس کیلئے وہ طریقہ ہے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اپنی لڑکی کو یورپ بھی بھیجے اور ایسے مدارس میں پڑھائے جہاں نہ عربی کی تعلیم ہے نہ عقائد اسلامیہ کی، اور پھر یہ بھی چاہے کہ وہ دیندار مسلمان عورت ہو اور اپنے ذوق اور مشرب میں ایک مشرقی عورت بن کر اٹھے، وہ دراصل اپنی لڑکی سے خرق عادت کا طالب ہے، جس کا صدور محض اتفاقاً اگر ہو بھی جائے تو یہ خود اس کے فراہم کیے ہوئے اسباب کا فطری نتیجہ نہ ہوگا! بلکہ ایک اتفاقی امر ہوگا، دنیا ہی

اتفاقی امر جیسا یہ کہ آپ کسی کو زہر کھلائیں اور وہ اتفاقاً بچ نکلے۔

یہاں میں ایک مثال پیش کرونگا۔ ۱۹۰۸ء میں دستور عثمانی کا جب اعلان ہوا تو آزاد خیال ترکوں کے لیڈروں میں سے ایک شخص احمد رضا بک نے کہا۔

"جب تک ایک ترک نوجوان کو اتنی آزادی حاصل نہ ہو کہ وہ غلطہ کے پل پر ایک ترک عورت کے ساتھ چل سکے، اور عورت کا چہرہ نقاب سے معرا ہو، اس وقت تک میں نہیں کہہ سکتا کہ ٹرکی میں کوئی دستور یا آزادی ہے"!

یہ ابتدا تھی۔ اب اس کی انتہا سنیے۔ حال میں یہ اطلاع مجھ کو پہنچی ہے کہ انقرہ کی پارلیمنٹ کے ارکان میں سے ایک شخص فالح رفقی بک جو پہلے شام میں جمال پاشا کا سکرٹری تھا، اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

جب تک ایک ترک لڑکی کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ جس سے چاہے اور جہاں چاہے شادی کر سکے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ بلکہ جب تک اس کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ جس مسلم یا غیر مسلم کے ساتھ چاہے رہ سکے اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ترکیہ شاہ راہ ترقی پر پہنچ گئی ہے"!

میں نے یہ تحریر خود نہیں دیکھی بلکہ روائیۃً سنی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح ہے۔

اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسئلہ صرف رفع حجاب کا نہیں ہے، اور نہ عورتوں کو مجرد ایاب و ذہاب کی آزادی دینے کا ہے۔ بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جس کی کڑیاں باہم پیوستہ ہیں اور اسکی معصوم ابتدا کو دیکھنے کے ساتھ ضروری ہے کہ اس کی ناگزیر انتہا تک بھی نظر پہنچ جائے۔ جو شخص عورتوں کی مطلق آزادی کا حامی ہے، وہ اگر اس سلسلہ کو انتہائی حدود تک قبول کرنے کے لیے بخوشی آمادہ ہو، اور کمال ترقی اسی کو سمجھتا ہو کہ ایک مسلمان عورت جس نصرانی یا یہودی یا مجوسی کے ساتھ چاہے نکاح یا سفاح کرنے میں آزاد ہو، تو مشکل دور ہوگئی اور کوئی نزاع باقی

نہیں رہی۔ اس کے بعد اس بحث کی کوئی ضرورت ہی نہیں کہ حجاب بہتر ہے یا بے حجابی۔ البتہ اگر کوئی شخص حریت اور عدم حریت دونوں کو جمع کرنا چاہے پہلے اس کو آزاد چھوڑ دے کہ جہاں چاہے جائے جس سے چاہے ملے جلے ہنسے بولے کھیلے سیر سپاٹے کرے، پھر جب اس کا دل کسی غیر سے الجھ جائے اور وہ اس کے ساتھ رہنا بسنا شروع کر دے، اور قانونی یا غیر قانونی تعلق قائم کرے تو حمیت اور غیرت کا جوش بھڑک اٹھے، تو میں کہونگا کہ یہ غلط ہے، خلاف عدل ہے، عقل اور منطق کے منافی ہے۔

حال میں حجت العرب، استاذ سید مصطفیٰ صادق الرافعی نے ایک کتاب لکھی ہے جو عربی لٹریچر کی بہترین کتابوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ اس میں انہوں نے ایک مصری نوجوان کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے جو یورپ سے تحصیل علم کرکے تازہ تازہ آیا ہوا تھا اور اس پر فرنگیت پوری طرح مسلط تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

میں نے اس نوجوان سے پوچھا کیا تم مصری ہو؟ اس نے جواب دیا "پورا اور پکا" میں نے کہا کیا تم اپنے علم اور تہذیب کی بنا پر اپنے آپ کو اس لائق سمجھتے ہو کہ تمہارے نمونے پر تمہارے ابنائے ملک کا نشو و نما ہو؟ اس نے کہا میں اس کی توقع رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کیا تم شرقی عورتوں کی آزادی مطلق اور مردوں کے ساتھ ان کی پوری مساوات کے قائل ہو، اور ان قبروں سے ان کو نکال لانا چاہتے ہو جن کا نام "گھر" ہے؟ اس نے کہا یہ تو میرا مذہب ہے میں نے کہا تمہاری کیا رائے ہے اگر مصری مرد یوروپین عورتوں سے شادیاں کریں اور ان سے اپنے گھروں کو آباد کریں؟ اس نے کہا غالباً ہمارے ملک کی بہتری کے لیے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے ہماری نسلوں میں تازہ خون آئے گا، اور ہماری سوسائٹی میں نظم اور شائستگی پیدا ہوگی اور ہماری معاشرت کی تعمیر نئی بنیادوں پر شروع ہو جائے گی۔ میں نے کہا بارک اللہ،

آپ نے خوب فرمایا۔ اب اگر ہم آپ سے مساوات کی درخواست کریں اور کہیں کہ اپنی بہن کو بھی کسی یورپین مرد سے دوستی کرنے اور اس کے ساتھ نکاح یا ازدواج مدنی کر لینے کی اجازت دیں تاکہ وہ بھی ایک یوروپین مرد لیکر آئے جس طرح آپ ایک یوروپین عورت لے کر آئے ہیں پھر ہر مصری عورت اسکی تقلید کرے اور مصری عورتوں کا رشتہ بھی فرنگیوں کے ساتھ قائم ہو جائے تو فرمایئے کہ اس باب میں جناب کی کیا رائے ہے؟ اس نے کہا اعوذ باللہ میں نے کہا خدا تمہاری عقل درست کرے کیا تمہاری غفلت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جب تک اللہ کی لعنت کو تم اپنی پوری قوم میں لبریز نہ دیکھ لو اسوقت تک تم کو احساس نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کی لعنت ہے اور کیا تم اپنی قوم کا حق اس وقت پہچانتے ہو جب اس کے مٹنے کا وقت قریب آ جائے؟ اس نے کہا میں اور مجھ جیسے لوگ شاذ ہیں، مگر قاعدہ کو تو ہمیشہ قاعدہ ہی رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم پر اور تمہارے قاعدہ پر خدا کا غضب ہو۔ بخدا ہمارے ملک کا تم جیسے لوگوں کے وجود سے پاک ہو جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تم ہمارے درمیان رہ کر اختلاط انساب کا فتنہ برپا کرو اور عربیت اور اسلامیت کی جڑیں اکھاڑو۔

یہاں ہمارے مقصد کے لیے استاذ رافعی کی صرف اتنی عبارت کافی ہے جو نتیجہ ہم بیان کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل ہو گیا، اور وہ یہ ہے کہ عورت کے مسئلہ میں یورپ والوں کی قدم بقدم پیروی کرنے کے چند توابع اور لوازم ہیں جن سے اس مسلک کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اس مسلک کو اختیار کریں تو ان ناگزیر توابع ولوازم کو بھی ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ پھر اعوذ باللہ کہنے کا کوئی موقع نہیں۔ بلکہ وہاں اعوذ باللہ پایا ہی نہیں جاتا۔ وہ ایک تہذیب ہے اور یہ ایک دوسری تہذیب ہے۔ وہ ایک نظریہ ہے اور یہ دوسرا نظریہ ہے، ہم ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی تہذیب اور ایک ہی نظریہ اختیار کر سکتے ہیں۔ دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے کہ ایک طرف آپ دوسری تہذیب بھی اختیار کریں اور جب وہ اپنے طبعی نتائج کے ساتھ پھل پھول

لائے تو اعوذ باللہ بھی کہیں۔

آپ نے دیکھا! جب استاذ رافعی نے اس مصری نوجوان سے کہا کہ کیا تم اپنی بہن کا کسی یورپین مرد کے ساتھ اختلاط گوارا کر سکتے ہو، تو اس نے کہنے کو اعوذ باللہ کہدیا، مگر فوراً ہی اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ اعوذ باللہ تو اس قاعدہ کے خلاف ہے جس کے متعلق اس نے چند ہی لمحوں پہلے دعویٰ کیا تھا کہ اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، یعنی وہی قاعدہ کہ عالم مغربی کی طرح عالم اسلامی میں بھی عورتوں کو حریت مطلقہ حاصل ہو، اور وہی قاعدہ جس کو فالح رفقی بک نے بیان کیا ہے، اور وہی قاعدہ جس کو ڈاکٹر عبد اللہ جودت نے پیش کیا تھا کہ ترکی نسل میں تازہ خون بہم پہنچانے کے لیے جرمن اور اٹالین قوموں سے شادی بیاہ ہونا چاہیے (جس پر ایک ترک نوجوان نے بگڑ کر کہا کہ ہم ترکوں کے خون کی طہارت اس سے بالاتر ہے کہ ہم اس کو پاک کرنے کے لیے یورپ والوں سے خون لیں)۔ پس جب یہ قاعدہ قبول کر لیا جائے تو اس کے لازمی اثرات مترتب ہونے پر اعوذ باللہ کہنے کا کیا موقع ہے؟ لہذا اس نے چونک کر پھر کہا کہ میں اور مجھ جیسے لوگ شاذ ہیں، مگر قاعدہ کو تو ابداً قاعدہ ہی رہنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تو ہمیشہ سلطان وہم ہی کے ماتحت رہیں گے۔ اور یہ جو اپنی بہنوں کو یورپ والوں کے حوالہ کرنے سے ہم انکار کرتے ہیں، تو یہ بھی اقتضاء عقل و حکمت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اسی وہم کے اتباع میں ہے۔ یعنی وہ قاعدہ جو اباحت کا مقتضی ہے، وہ تو اپنی جگہ صحیح ہے، مگر ہمیں علانیہ اس کی اجازت دیتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہماری بہن کسی غیر مسلم نوجوان کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرے اور نکاح شرعی کے بغیر اپنے نفس کو کسی کے حوالہ کر دے۔ ہم پر ابھی تک پچھلی تہذیب کا اثر ہے اس لیے ہمیں شرم آتی ہے۔ مگر ہمیں امید ہے کہ ہمارے بیٹوں یا پوتوں میں یہ چیز باقی نہ رہے گی اور ۱۹۵۰ء میں وہ مصری پارلیمنٹ سے اس قسم کی آزادی کو جائز تسلیم کرا لیں گے۔

بہت سے لوگ جو میرے اس مضمون کو پڑھیں گے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اس موقع پر منہ بگاڑ کر بول اٹھیں گے کہ یہ کیا تم نے کہنا شروع کر دیا۔ اباحت اس حریت مطلقہ کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم عورت کی آزادی کے حامی بھی ہوں اور دین و عصمت کے پرستار بھی۔ جائز ہے کہ ہم بے پردگی کی دعوت تو دیں مگر ہم اپنی بہنوں کا غیروں کی زینت آغوش بننا پسند نہ کریں ہم ہرگز یہ نہیں سمجھتے کہ جن قوموں نے اپنی عورتوں کو آزادی دے رکھی ہے، اور جو پردے کے نام تک سے نا آشنا ہیں وہ مردوں کی نیک چلنی اور عورتوں کی عفت کی قدر کرنے میں ہم سے کچھ کم ہیں۔ عورتوں کی حریت کے ساتھ ان کی تعلیم بھی تو ہے۔ اور عورت جب تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جاتی ہے تو اس کا علم اس کے لیے وہ حجاب بن جاتا ہے جو اسے فحش کاری سے روکتا ہے۔ یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں ضرور کہی جائیں گی جن کی بکثرت تکرار ہو چکی ہے۔ مگر میں اپنے ان دوستوں سے کہوں گا کہ ٹھیرو! جلد بازی سے کام نہ لو۔ تم بحث کے مختلف گوشوں کو خلط ملط کر رہے ہو، اور اس بحث کے اتنے گوشے ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مقالہ میں نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے دو تین مقالے بھی کافی نہیں ہیں۔ عفت اور صیانت اور حفظ انساب اور اطاعت احکام دین کے ساتھ جو آزادی اور روشنائی ممکن ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ عورت اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر نکلے، چلے پھرے، حسب ضرورت چہرہ بھی کھول دے شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ اس نے چہروں کو ڈھانکنا فرض نہیں کیا ہے، نہ وہ اس کا حکم دیتی ہے کہ عورت جیتے جی مدفون ہو جائے۔ مگر تم کو نہ بھولنا چاہیے کہ یہ آزادی اور روشنائی غیر مردوں کے ساتھ خلا ملا، اور غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط کی حد تک نہیں ہے۔ اور اگر مسئلہ اسی حد تک محدود رہے تو اس میں وہ ترقی ممکن نہیں جس کو فالح رفقی اور عبداللہ جودت اور مصری نوجوان اور ایسے ہی بہت سے حضرات ترقی سمجھتے ہیں کیونکہ اس ترقی کیلئے صرف اتنی آزادی تو کافی نہیں ہے کہ

ایک مسلمان عورت گھر سے باہر نکل سکے اور حسب ضرورت چہرہ کھول سکے۔اس درجہ آزادی کے متعلق تو وہ بھی جانتے ہیں کہ وہ شریعت میں جائز ہے، اور صدیوں تک مسلمان عورتیں اس مستفید ہوتی رہی ہیں، وہ نکلتی تھیں لین دین کرتی تھیں، بڑے بڑے کاموں میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں اور شریعت ان کو نہ روکتی تھی۔ اس حد سے بڑھ کر جو حجاب ہے، وہ فرط غیرت کا نتیجہ ہے نہ کہ حکم شریعت پر مبنی لیکن یہ درجہ تو اس گروہ کے نزدیک ترقی کا ادنیٰ درجہ ہے۔ وہ جس آزادی کے طالب ہیں وہ بعینہ وہ آزادی ہے جو یورپین عورتوں کو حاصل ہے یعنی زینت و آرائش کے ساتھ نکلنا، جسم کے محاسن کو نمایاں کرنا۔مردوں کے ساتھ خلوت و جلوت میں گھلنا ملنا، اور ازدواج میں اپنی خواہش نفس کے سوا کسی ضابطہ کا پابند نہ ہونا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اگر یہی وہ چیز ہے جس کے تم طالب ہو تو پوری جرأت کے ساتھ اس کا اور اس کے تمام توابع اور متممات کا صاف اقرار کرو، اور اس مصری نوجوان کی طرح اس کے بعض شرم ناک پہلوؤں پر اعوذ باللہ کہنا چھوڑ دو، کیونکہ آخر یہ بھی تو ایک نظریہ ہے، اور متمدن دنیا کے کروڑوں آدمی اس نظریے کے قائل اور اس پر عامل ہیں، کیا حرج ہے کہ تم بھی ہیئت اجتماعیہ میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم ایک طرف اس حریت مطلقہ کے بھی طالب ہو اور دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہو کہ مسلمان عورت عفت و عصمت اور ازدواج کے معاملات میں اسلامی حدود کی پابند رہے تو ہم کہیں گے کہ یہ نقیضین ہیں، ان کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔ایک جہت سے غیر مقید آزادی اور دوسری جہت سے صرف مسلمان کے ساتھ تعلق اور کلیۃً شرعی تعلق کی قید! کونسی منطق ہے جو ان دونوں کا اجتماع ثابت کر سکتی ہے؟

اگر تم اُس مقید آزادی پر قناعت کر سکتے ہو جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، تو شریعت اس کی پوری پوری ضمانت دیتی ہے، اور اس سے تم کو نہیں روکتی۔ اور اگر تم اُس مطلق اور مکمل حریت

کے طالب ہو جو یورپ کی عورتوں میں پائی جاتی ہے تو خوب جان لو کہ اسلام اور ایسی آزادی باہم مجتمع نہیں ہو سکتے۔ جس کا جی چاہے اسلام کو اختیار کرے اور جو چاہے اس آزادی کو اختیار کرے۔ صرف یہی نہیں کہ اسلام اس کا مخالف ہے۔ بلکہ نصرانیت بھی اس کی مخالف ہے۔ نصرانیت بھی مرد و زن کے اختلاط بلا نکاح کو جائز نہیں رکھتی اور غیر مسیحی مرد کے ساتھ مسیحی عورت کے اقتران کو روکتی ہے بلکہ اس معاملہ میں مسیحیت کی قید اسلام سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اسلام نے صرف مسلمان عورت پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ مسلمان کے سوا کسی سے نکاح نہ کرے۔ مسلمان مرد کو وہ اس کا پابند نہیں بناتا۔ مگر مسیحیت مرد اور عورت دونوں پر یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ وہ صرف مسیحی سے ازدواجی تعلق قائم کریں پھر دین مسیحی اپنے پیرووں کو طلاق کے معاملہ میں بھی زیادہ سخت قوانین سے جکڑتا ہے۔ وہ مرد اور عورت دونوں سے طلاق کا حق سلب کرتا ہے اور اگر وہ اس کا اقدام کریں تو ان کے نکاح ثانی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین مسیحی میں بھی عورت کی حریت مطلق ہے اور نہ تام۔ یورپ اور امریکہ میں جو لوگ ان قواعد کے خلاف عمل کر رہے ہیں وہ مسیحیت کے پابند نہیں ہیں، اور جو مسیحیت کے پابند ہیں وہ عورت کی حریت مطلقہ کے قائل نہیں ہیں۔

رہی یہ بات کہ جن قوموں میں حجاب نہیں ہے وہ عورتوں کی عفت و صیانت میں ان قوموں سے کم نہیں ہیں جو حجاب کی قائل ہیں، تو یہ ایک غلط بات ہے۔ اس معاملہ میں ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو مشرق کے عیسائیوں کو مثال میں نہ لیجئے، کیونکہ وہ بھی ہماری ہی طرح مقید آزادی کے قائل ہیں اور جن امور میں عفت کے لیے خطرہ ہے ان کو جائز نہیں رکھتے۔ صحیح مقابلہ عالم اسلام اور یورپ کے درمیان ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ عفت اور صیانت اخلاق میں یورپ کا وہی درجہ ہے

جو عالم اسلامی اور عالم نصرانی شرقی کا ہے؟ یورپ کے ایک شہر پیرس میں جو فسق و فجور ہو رہا ہے صرف وہی تمام عالم اسلامی کے مجموعی فسق و فجور سے مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے!

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ صرف تعلیم کے اثر سے عورت اخلاق کے اُس بلند مرتبے پر پہنچ سکتی ہے جہاں حجاب اور شوہر کی حفاظت سے وہ بے نیاز ہو جائے، تو باوجودیکہ ہم تعلیم کے مہذب بنانے والے اور اخلاق کو سنوارنے والے اثرات کے منکر نہیں ہیں یہ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس معاملہ میں بجائے خود کافی ہے اور اس کے بعد قیود شرعیہ اور حفاظت زوجیہ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ تعلیم (اور خصوصاً وہ تعلیم جو آج کل دی جا رہی ہے) نہ تو خوف کی قائم مقام ہے اور نہ تنہا اتنی قوت رکھتی ہے کہ انسان کو قانون اور اخلاق کی حدود سے تجاوز کرنے میں مانع ہو۔ ہم جانتے ہیں اور روز مرہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ علم کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گئے ہیں، ان کے علم و فضل نے ان کی عفت اور پاک دامنی اور افعال قبیحہ سے اجتناب میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا۔ مشرق کے باشندے علم میں مغرب سے بہت پیچھے ہیں، مگر فسق و فجور جتنا وہاں پایا جاتا ہے اتنا یہاں نہیں پایا جاتا، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں مذہب کا اثر زیادہ گہرا ہے، اور عورتوں پر مردوں کی قوامیت باقی ہے۔ مسلمان اور مشرقی مسیحی عورت اپنے خدا سے بھی ڈرتی ہے اور اپنے شوہر سے بھی، اگرچہ وہ جاہل ہے، بخلاف اس کے اکثر و بیشتر مغربی عورتیں اب اس حال میں نظر آتی ہیں کہ نہ ان کو خدا کا خوف ہے نہ شوہر کا، اگرچہ وہ بہت تعلیم یافتہ ہیں۔

اب ایک اعتراض اور باقی ہے جو یقین ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ضرور پیش کیا جائے گا جو اپنے آپ کو "جدید الخیال" کہلانا پسند کرتے ہیں، اور جن کو دعویٰ ہے کہ ہم اوہام اور عقائد سے آزاد ہیں اور محض عقول علمیہ اور بصائر فنیہ کے بل پر جادۂ ترقی میں گام زن ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ایک مسلمان جو اپنی بہن یا بیٹی کو کسی مسیحی یا یہودی یا بت پرست کے پہلو میں بیٹھے

نفرت کرتا ہے، یا ایک مسیحی جو اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بہن یا بیٹی کسی مسلم یا یہودی یا وثنی کی بیوی بنے، یہ سب اوہام اور رسوخ عقائد کی تاثیرات ہیں، بلکہ یہ محض وساوس ہیں جن کو حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ اسی طرح ایک مسلمہ یا مسیحیہ کے کسی مرغوب خاطر مرد کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرنے پر جو ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے، یہ بھی اوہام و وساوس کا نتیجہ ہے جو شدت تکرار اور مرور زمان کی وجہ سے شرف اور غیرت اور حمیت بن گیا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ ان اوہام سے دلوں کو پاک کر دے اور ان میں حقائق کے سوا کسی اور چیز کے لیے گنجائش ہی نہ رہنے دے۔ دور حاضر کی بیداری کو جو سب سے بڑی خدمت انجام دینی ہے وہ تو اوہام کا استیصال اور خرافات کی فرمانروائی کا قلع قمع ہی ہے۔

اگر کسی کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو ہم کو پھر اسی قاعدہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو فالح رفقی اور عبداللہ جودت اور اس مصری نوجوان نے بیان کیا ہے۔ یہاں ہم اس سوال سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ یہ قاعدہ بجائے خود صحیح ہے یا غلط۔ ہم صرف یہ کہیں گے کہ اگر تم یورپین تہذیب اور اس کے نظریات کو اسلام، اور عفت و طہارت کے متعلق اس کے نظریات پر ترجیح دیتے ہو تو علانیہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اس کے تمام لوازم اور متممات سمیت اختیار کر لو اور جب اس کے ایسے شرمناک پہلو سامنے آئیں جو کسی طرح اس سے منفک نہیں ہو سکتے تو اس سے دامن بچانے کے لیے کج بحثیاں کرنا چھوڑ دو۔ پھر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی بحث باقی نہ رہے گی۔ البتہ اگر تم عفت اور طہارت کے ان اصولوں کا التزام کرو جو اسلام اور مشرقی تہذیب میں پائے جاتے ہیں اور عورت کے اخلاق میں عصمت کو وہ اہمیت دو جو ایک مسلمان اور مشرقی دیتا ہے، اور اولاد کے صرف اپنے باپ کی صلب سے پیدا ہونے کا اطمینان کرنا اتنا ہی ضروری سمجھو جتنا ہماری ملت میں سمجھا جاتا ہے تو اس بنیاد پر ہم اور تم بحث کر سکتے ہیں کہ ان اغراض

کے لیے وہ مقید آزادی زیادہ مفید ہے جو اسلامی شریعت نے عورت کو دی ہے، یا وہ غیر مقید آزادی جو یورپ نے اسے بخش رکھی ہے۔

پھر میں ان سے یہ بھی کہوں گا کہ انسان جب تک انسان ہے اور جب تک اس کے وجود کی یہ ترکیب باقی ہے ممکن نہیں کہ وہ اُس چیز سے خالی ہو جس کو "اوہام" اور عقائد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر صرف حقائق مجردہ کی بنیاد پر زندگی بسر کرے تو اس کی زندگی بہائم کی زندگی سے اشبہ ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر حقیقت مجردہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نکاح اور سفاح دونوں ایک نظر آئیں گے۔ عمل کے لحاظ سے اس شخص میں جو نکاح کرتا ہے اور اس شخص میں جو زنا کرتا ہے، قطعاً کوئی فرق نہیں۔ پھر کیا چیز ہے جس کی بنا پر ایک شخص اپنی بیوی کی عصمت میں ذرا سا بھی شبہہ پاتا ہے تو اسے طلاق دے دیتا ہے، اور اگر وہ کسی غیر کو اس کے ساتھ ملوث پاکر قتل کر دے تو دنیا کا کوئی قانون حتیٰ کہ جدید ترین جمہوری دیما قریطی قانون بھی اس کو مجرم نہیں سمجھتا؟ تم کہو گے کہ یہ صرف اس وجہ سے جائز ہے کہ زانی ایک ایسی عورت سے تمتع کرتا ہے جو ایک دوسرے شخص کی بیوی بن چکی ہے۔ مگر میں کہوں گا کہ اگر وہی عورت برضا و رغبت کسی اور شخص سے بھی ویسا ہی تعلق قائم کرے تو شوہر کے لیے کیوں جائز ہے کہ اس کو قتل کر دے اور وہ غریب اُسی فعل کی پاداش میں کیوں مارا جائے جو باعتبار حقیقت تجرد خود شوہر کے فعل سے کچھ بھی مختلف نہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ نوع انسانی کا اکثر و بیشتر حصہ اس پر متفق ہو گیا کہ یہ فعل سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کی ناپاکی سب ناپاکیوں سے بڑھ کر ہے، اور خاندان کے شرف و مجد کو تباہ کرنے والی کوئی چیز اس سے زیادہ نہیں؟ یہ سب آخر کیوں ہے؟ اور پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد و زن کا جو تعلق صورت شرعیہ کے بغیر انسان کی نگاہ میں آنا برا ہے وہی تعلق جب دو آدمیوں کی گواہی یا ایک کاغذ کی خانہ پُری سے قائم ہوتا ہے تو ناموس عظیم اور

عمل شریف بن جاتا ہے، خود باپ اپنی بیٹی کو شادان و فرحاں ایک شخص کے حوالہ کرتا ہے، اقو عروس کے رشتہ دار اس پر خوشیاں مناتے ہیں، اور اسی بات پر مبارکبادیں قبول کرتے ہیں جو اگر اس طریقہ سے انجام نہ پاتی تو وہ کٹ مرنے پر طیار ہو جاتے ؟ جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ فعل اگرچہ بقاۓ نوع اور تناسل کے لیے دونوں حالتوں میں یکساں ضروری ہے، لیکن انسان نے مدتوں سے یہ ٹھیرا لیا ہے کہ اتفاق شرعی کے ساتھ وہ حلال اور قابل فخر اور موجب تہنیت و شادمانی ہے، اور معاملہ شرعیہ کے بغیر فضیحت اور جنایت اور گناہ کبیرہ ہے۔ یہ دونوں اعتبار جو دلوں میں راسخ ہو گئے ہیں ان کی کوئی بنیاد بجز اس کے نہیں کہ ایک غیر معلوم زمانہ سے نوع بشری میں یہی قاعدہ چلا آرہا ہے، اور بالجملہ یہ "وہم" ہی ہے جس کو نفس عمل کی طبیعت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ وہم خواہ کتنا ہی مقدس ہو مگر اس کا مقدس ہونا اس کو مجرد ایک اصطلاح اور قرارداد اور "وہم" ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان جب تک انسان ہے اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس کے اعمال سراسر طبیعت اور مجرد حقیقت پر مبنی ہوں، اور اوہام و عقائد کا ان میں کچھ بھی دخل نہ ہو۔ حیوانات کے سوا کوئی مخلوق نہیں جس کے اعمال "اوہام" وخیالات سے خالی ہو کر صرف حکم طبیعت پر قائم ہوں۔

اسباب زوال امت علامہ امیر شکیب ارسلان کو ہم نے لکھا تھا کہ کوئی ایسی چیز بھیجئے جو آپ کے نزدیک مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ علامہ موصوف نے اس کے جواب میں ایک نہایت ہی اہم رسالہ ارسال فرمایا ہے مسلمانان ہندوستان نے ایسا عظیم مفید اور ولولہ انگیز مضمون بہت کم دیکھا ہو گا۔ تین آنے کے ٹکٹ بھیج کر ایک کتاب منگوائیں اور سوا روپیہ کی آٹھ کتابیں طلب فرمائیں مسودہ کا حجم صہ ۱۴۱ ہے۔
(پتہ) سکرٹری سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور۔

بشارات الانبیاء

صحائف آسمانی میں نبوت محمدیؐ کی پیشین گوئیاں

از جناب مولوی فضل حق صاحب

تیرھویں صدی ہجری (انیسوی صدی عیسوی) میں جب انگریزی سلطنت کا اقتدار پوری قوت کے ساتھ ہندوستان پر قائم ہوگیا تو عیسائی مشنریوں کی تبلیغ کا فتنہ عظیم اٹھا۔ اگرچہ کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ سے ان کی تبلیغ کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا، مگر اب علی الاعلان بازاروں اور عام گذرگاہوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کے سامنے اسلام اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر حملے کیئے جانے لگے اور مسلمانوں کو ان کے دین اور ان کے نبی اور ان کی کتاب مقدس کے متعلق وہ سب کچھ سنایا جانے لگا جس کے سننے کی تاب ان میں کبھی نہ تھی یہ کام بظاہر مذہبی تبلیغ کے رنگ میں تھا لیکن اس کے پیچھے ایک بڑا سیاسی مقصد بھی تھا، بلکہ درحقیقت اصل مقصود وہی تھا۔ ہندوستان کے دور اندیش فاتحین یہ سمجھتے تھے کہ جس قوم سے انہوں نے حکومت چھینی ہے اس میں اگر کچھ بھی قوت و طاقت باقی رہی تو وہ ہمیشہ ان کے لیے ایک خطرہ بنی رہے گی۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس قوم کی قوت کا اصلی مرکز اس کا مذہب اور جذبۂ غیرت مذہبی ہے۔ اس لیے جب ہندوستان کی قوت مدافعت کو مغلوب کرنے میں ان کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوگئی تو انہوں نے اس امر کی کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کے جراثیم پھیلاکر ان کے عقائد کو کمزور اور ان کے اعمال کو خراب کر دیا جائے

یا بد رجۂ آخر ان کو اتنا بے حمیت بنا دیا جائے کہ وہ اپنے دین اور اپنے نبی تک کی عزت پر ہر قسم کے حملوں کو برداشت کرنے لگیں اور ان کے دلوں کی وہ چنگاری بجھ جائے جس کے کسی وقت آتش فشاں بن جانے کا خوف کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مسیحی پادری اپنے مشن پر نکلے تو ایک بڑی طاقت ان کی پشت پر تھی، پولس اور عدالت کی حمایت ان کو حاصل تھی، اور ہر قسم کی بدزبانی کا لائسنس ان کو ملا ہوا تھا۔

یہ زمانہ تھا جب علمار حق کی ایک جماعت اسلام کی حمایت کے لئے اٹھی اور اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ پادریوں کا مقابلہ دراصل ایک بڑی قوت کا مقابلہ ہے۔ نہایت دلیری کے ساتھ ان سے مناظرے کیے، ان کے حملوں کے رد میں رسالے لکھے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کر کے خود ان کے مذہب پر جوابی حملے کیے جن کے جواب سے بڑے بڑے مسیحی علمار عاجز ہو گئے۔ اس جہاد عظیم میں کوئی ان سرفروش مجاہدین کی مدد کرنے والا نہ تھا، مسلمان شکستہ دل اور پراگندہ حال تھے ان میں اتنی قوت باقی ہی نہ تھی کہ اپنے دین کے مددگاروں کا ہاتھ بٹاتے۔ حکومت کی طرف سے ان کی راہ میں ہزاروں رکاوٹیں تھیں۔ خود ان کے پاس مقابلہ کے لیے کوئی سروسامان نہ تھا مگر باوجود اس کے ہر قسم کی مصیبتیں جھیل کر انھوں نے اعداے اسلام کا مقابلہ کیا اور زبان و قلم سے کفر و الحاد کے سیلاب عظیم کو روکنے میں اپنی قدرت و استطاعت سے بڑھ کر جدوجہد کی۔

انہی مجاہدین اسلام میں سے ایک مولنا رحمۃ اللہ دہلوی بھی تھے۔ پادریوں کے مقابلہ میں ان کے معرکے آج تک یادگار ہیں۔ انہوں نے مسیحی لٹریچر کا وہ تمام ذخیرہ فراہم کیا جو اس زمانے میں مل سکتا تھا۔ نہایت دقت نظر سے اس کا مطالعہ کیا، اور اس پر ایسی زبردست تنقیدیں لکھیں کہ کسی بڑے سے بڑے حامی نصرانیت سے بھی ان کا جواب نہ بن پڑا۔ ان کے اس زبردست جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی اور انھوں نے ہندوستان سے حجاز کی راہ لی۔ اس زمانے میں مسیحی سلطنتوں کے اثر سے پادریوں کا فتنہ

ممالک عربیہ میں پھیل رہا تھا۔ مصر و شام و روم کے علمائے اسلام کے لیے یہ فتنہ نیا تھا اور وہ مسیحی لٹریچر پر اتنی وسیع نظر نہ رکھتے تھے کہ اس کا مقابلہ کر سکتے۔ مولانا رحمۃ اللہ نے یہ حال دیکھکر اظہار الحق کے نام سے عربی زبان میں ایک زبردست کتاب لکھی جس میں تحریف، نسخ، تثلیث، قرآن اور نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسائل پر تمام ان دلائل کو جمع کر دیا جو مسیحی علماء کے مقابلہ میں کام آ سکتے تھے۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں بمقام قاہرہ طبع ہوئی اور ممالک عربیہ میں سیلاب مسیحیت کو روکنے کے لیے اس نے وہ کام کیا جو شائد کسی دوسری کتاب نے نہیں کیا۔

ذیل کا مضمون اسی معرکۃ الآرا کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس میں علامۂ ہندی کے صرف ان دلائل کو جمع کیا گیا ہے جو انہوں نے نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر خود مسیحیوں کے صحائف آسمانی سے فراہم کئے ہیں۔ امید ہے کہ اس مضمون کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا جائیگا۔

مصنف علام نے باب باندھا ہے اخبار الانبیاء المتقدمین علیہ عن نبوتہ علیہ السلام۔ اس باب کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ قسیسوں نے اس مسئلہ میں عوام کو بہت دھوکے دیے ہیں، اس لیے قبل ازیں کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کو نقل کیا جائے ہم بطور مقدمہ آٹھ ایسے امور بیان کریں گے جن کا مطالعہ ناظرین کے لیے افزایش بصیرت کا موجب ہوگا۔

۱۔ بشارت انبیاء کا اثبات انبیائے بنی اسرائیل مثلاً اشعیا، ارمیا، دانیال، حزقیال اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ نے آیندہ آنے والے بہت سے حوادث کی پیشین گوئیاں کی ہیں، مثلاً حادثۂ بخت نصر، حادثہ قورش، سکندر اور اس کے خلفاء اور وہ حوادث جو سرزمین ادوم اور مصر اور نینوا اور بابل میں پیش آئے۔ اب یہ قطعاً بعید از قیاس ہے کہ ان انبیاء میں سے کوئی بھی اس عظیم الشان واقعہ (یعنی بعثت محمدی) کی خبر نہ دیتا جو ابتدا میں اپنے ظہور کے وقت ایک بہت ہی

چھوٹا سا پودا تھا لیکن آگے چل کر ایسا تناور درخت بن گیا کہ اس کی شاخیں تمام روئے زمین پر پھیلیں اور آسمان کے پرندوں نے ان میں آشیانہ کیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس نے بڑے بڑے جبابرہ اور اکاسرہ کی بساط سلطنت الٹ دی، مشرق اور مغرب میں پھیل کر تمام ادیان کو مغلوب کیا، تیرہ صدیوں سے زمین کے اکثر و بیشتر حصوں پر اس کے اثرات چھائے ہوئے ہیں اور اس مدت میں لاکھوں علماء، حکماء، صاحب کشف و کرامت اولیا اور عظیم الشان سلاطین اس کے زیر اثر پیدا ہوئے ہیں یقیناً یہ حادثہ اپنی اہمیت میں نینوا، بابل، اور رُوم کے حوادث سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ پھر کیا عقل سلیم یہ باور کر سکتی ہے کہ اُن حقیر حوادث کے متعلق تو انبیاء سابقین نے خبریں دی ہوں مگر اس مہتم بالشان واقعہ کی کوئی خبر نہ دی ہو؟

۲- بشارتوں کا اجمال | نبی سابق جب نبی لاحق کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرتا ہے تو وہ ایسی مفصل اور مشرح نہیں ہوتی کہ آنیوالا نبی فلاں ملک فلاں قبیلہ فلاں سنہ میں پیدا ہوگا، بلکہ ایسی پیشین گوئی اکثر عوام کے لیے مجمل ہوتی ہے اور خواص کے لیے قرائن کی وساطت سے جلی اور واضح ہوا کرتی ہے البتہ خواص کے لیے اسمیں اتنی پوشیدگی باقی رہ جاتی ہے کہ اُس پیشین گوئی کا صحیح مصداق کون ہے۔ مگر یہ پوشیدگی بھی اس وقت دور ہوجاتی ہے جب آنے والا نبی دعویٰ کرتا ہے کہ نبی سابق نے اسی کے آنے کی پیشین گوئی کی تھی اور اس کے ثبوت میں معجزات اور علامات نبوت پیش کرتا ہے اس وقت علماء اور خواص پر پیشین گوئی کا مصداق بلا کسی شک و ریب کے ظاہر ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے امت سابقہ کے علماء کو نئے آنے والے نبی کی زبان سے ملامت کی جاتی ہے کہ وہ اُس نبی کو پہچان لینے کے بعد بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام علماء یہود کو اس طرح ملامت کرتے ہیں۔

"اے شریعت کے سکھلانے والو تم پر افسوس کہ تم نے معرفت کی کنجی لے لی تم آپ بھی داخل نہ ہوئے اور

داخل ہونے والوں کو بھی روک رکھا۔ (لوقا باب ۱۱ آیت ۵۲)۔

لیکن مسیحیوں کا مذاق یہ ہے کہ اس باب میں علماء، تو درکنار خود انبیا بھی نہیں جانتے کہ جو پیشین گوئیاں پہلے کی گئی ہیں ان کے مصداق وہ خود ہیں۔ چنانچہ یوحنا باب اول میں ہے

اور یوحنا کی گواہی یہ تھی جب کہ یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ؟ کیا تو الیاس ہے، اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے، اس نے جواب دیا نہیں، تب انہوں نے اس سے کہا کہ تو کون ہے تاکہ ہم انہیں جنہوں نے ہم کو بھیجا کوئی جواب دیں، کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو درست کرو مگر یہ فریسیوں کی طرف سے بھیجے گئے تھے انہوں نے اُس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ الیاس، اور نہ وہ نبی پس کیوں بپتسما دیتا ہے (یوحنا باب ۱۔ آیت ۱۹ تا ۲۵)

یہاں علمائے یہود نے "وہ نبی" کا لفظ جو استعمال کیا ہے، اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مراد وہ نبی موعود ہے جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے کتاب استثناء کے اٹھارہویں باب میں دی ہے (حسب تصریح علمائے مسیحیہ) یہ کاہن اور لاوی علماء یہود میں سے تھے اپنی کتابوں سے واقف تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ یحییٰ علیہ السلام نبی ہیں، لیکن اُن کو شک اس میں تھا کہ آیا وہ عیسیٰ ہیں یا الیاس یا وہ نبی موعود، جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تینوں انبیاءؑ کی علامات ان کی کتابوں میں اتنی واضح نہ تھیں کہ عوام نہیں تو کم از کم خواص علماء کے لیے ہی ان میں کوئی شبہہ باقی نہ رہتا۔ اسی لیے انہوں نے پہلے دریافت کیا، کہ کیا تو مسیح ہے، جب یحییٰ علیہ السلام نے انکار کیا تو پوچھا کہ کیا تو الیاس ہے ؟ اور جب انھوں نے اس سے بھی انکار کیا تو پوچھا

کیا تو وہ نبی ہے ؟ اگر علامات واضح ہوتیں تو شک کی گنجایش نہ رہتی۔

یہ تو خیر علمار کا حال تھا۔ اناجیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت یحییٰؑ بھی اپنی حقیقت سے واقف نہ تھے، اسی لیے اُنہوں نے اپنے الیاسؑ ہونے سے انکار کیا حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت یہ ہے کہ الیاس وہی ہیں:۔

"اور الیاس جو آنے والا تھا یہ ہی ہے چاہو تو قبول کرو۔ (متی باب ۱۱۔ آیت ۱۴)۔

اور اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا پھر فقیہ کیوں کہتے ہیں کہ الیاس کا آنا ضرور ہے؟ یسوع نے انھیں جواب دیا کہ الیاس البتہ پہلے آویگا۔ اور سب چیزوں کا بندوبست کریگا۔ پر میں تم سے کہتا ہوں کہ الیاس تو آچکا لیکن اُنہوں نے اس کو نہیں پہچانا۔ بلکہ جو چاہا اُس کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ابن آدم بھی اُن سے دکھ اٹھاوے گا۔ تب شاگردوں نے سمجھا کہ اُس نے ان سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا" (متی باب ۱۷۔ آیتہ ۱۰ تا ۱۳)۔

آخری عبارت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ علمائے یہود یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہی الیاس ہیں، اور اسی لیئے انہوں نے حضرت یحییٰ کے ساتھ وہ برتاو کیا جو مشہور ہے۔ اسی طرح حوارین بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ وہی الیاس ہیں، حالانکہ مسیحیوں کے عقیدے میں حوارین نہ صرف انبیا ہیں بلکہ حضرت موسیٰ سے بھی ان کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے، اُنہوں نے حضرت یحییٰ سے بپتسمہ لیا، ان کو بارہا دیکھا، اور یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ کے آنے سے پہلے ان کا آنا ضروری ہے، باوجود اس کے وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

پھر انجیل یوحنا کے باب اول آیتہ ۳۳ میں حضرت یحییٰ کا یہ قول منقول ہے۔

"اور میں اسے نہ جانتا تھا پر جس نے مجھے بھیجا کہ پانی سے بپتسمہ دوں، اُس نے مجھے کہا کہ جس پر تو روح کو اُترتے اور ٹھہرتے دیکھے وہی ہے جو روح قدس سے بپتسمہ دیتا ہے،

یحییٰ علیہ السلام کے اس قول "میں آسے نہ جانتا تھا" کا مطلب مسیحی علماء کے ہاں یہ ہے کہ میں صاف طور پر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ مسیح جس کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یہی ہے، اس سے یہ راز فاش ہوتا ہے کہ تیس سال تک حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ کو نہ پہچان سکے اور انہوں نے اُن کو اس وقت پہچانا جب روح القدس کا نزول ہوا۔ شاید ایک باکرہ کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی مسیح کی مختص علامات میں سے نہ تھا کہ اتنے بڑے معجزے سے بھی حضرت یحییٰ ان کو نہ پہچانتے۔ خیر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام اُن کبار انبیا میں تھے جنہوں نے (حسب تصریح انجیل متی باب ۱۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت دی اور مسیحیوں کے دعوی کے مطابق حضرت عیسیٰ جن کے رب اور خداوند تھے اور جن کا مسیح سے پہلے آنا ضروری تھا، اور جن کا الیاس ہونا بھی یقینی تھا۔ جب ایسے نبی اشرف کا حال یہ ہے کہ آخر عمر تک وہ نہ اپنے آپ کو پہچانا اور نہ اپنے خداوند اور رب کو تیس برس تک پہچان سکا اور جب حضرت موسیٰ اور تمام انبیائے بنی اسرائیل سے زیادہ فضیلت رکھنے والے انبیاء یعنی حواریوں کا حال یہ ہے کہ وہ حضرت یحییٰ کے جیتے جی ان کے الیاس ہونے سے ناواقف رہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلے انبیاء کی پیشین گوئیوں سے کسی نبی کو پہچاننے میں ان کے علماء اور عوام کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اور اس میں انھوں نے کتنی ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔

پھر دیکھیے کہ کاہنوں کا سردار قیافا خود یوحنا کی شہادت کے مطابق نبی تھا۔ (ملاحظہ ہو باب ۱۱ آیہ ۵۱) اور یہی وہ حضرت ہیں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی توہین و تکفیر کی اور ان کے قتل کا فتویٰ دیا (ملاحظہ ہو انجیل متی باب ۲۷) اگر علمائے یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں حضرت عیسیٰ کی علامتیں صاف صاف موجود ہوتیں تو قیافا نبی کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنے خداوند اور رب کی تکفیر کرتا اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کرتا۔

پھر متی اور لوقا نے اپنے تیسرے باب میں اور مرقس و یوحنا نے اپنی انجیلوں کے

پہلے باب میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق اشعیا نبی کی پیشین گوئی نقل کی ہے اور یوحنا نے خود یحییٰ علیہ السلام کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ وہ پیشین گوئی انھیں کے حق میں ہے کتاب اشعیا باب چالیس آیہ ۳ میں اس پیشین گوئی کے الفاظ صرف اس قدر ہیں :۔

"بیابان میں ایک منادی کی آواز تم خداوند کی راہ درست کرو صحرا میں ہمارے خدا کے لیے ایک سیدھی شاہ راہ تیار کرو۔"

اس میں نہ تو یحییٰ علیہ السلام کے حالات ہیں نہ صفات نہ خروج کا زمانہ، نہ مکان کی ایسی تعیین کہ کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ اگر یحییٰ علیہ السلام یہ دعویٰ نہ کرتے کہ یہ بشارت اُن کے حق میں ہے اور عہد جدید کے مولفین اس کی تصریح نہ کرتے تو مسیحیوں کے عوام تو درکنار اُن کے علماٗ اور خواص پر بھی اس بشارت کی حقیقت ظاہر نہ ہوتی کیونکہ بیابان میں پکارنے کا وصف تو تمام ان انبیاے بنی اسرائیل میں عام ہے جو اشعیا نبی کے بعد آئے ہیں، بلکہ یہ وصف عیسیٰ علیہ السلام پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ بھی یحییٰ علیہ السلام کی طرح ندا کیا کرتے تھے کہ توبہ کرو آسمان کی بادشاہت قریب آگئی۔ آگے چل کر ہم ان پیشین گوئیوں کا حال بیان کریں گے جو اناجیل کے مصنفین نے مسیح علیہ السلام کی بعثت کے متعلق انبیاے متقدمین سے نقل کی ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے تم کو معلوم ہوجائیگا کہ وہ سب بھی ایسی ہی ہیں، اسی طرح ہمارا بھی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ انبیائے سابقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی ہیں وہ سب اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ اُن میں مخالف تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ امام فخرالدین رازی رح آیتہ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ کی تفسیر کرتے ہوے فرماتے ہیں "یہ بات ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ بالباطل میں (ب) استعانت کے لیے ہے جیسے کَتَبْتُ بِالْقَلَمِ۔ معنی یہ ہوے کہ حق کو ان شبہات کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو جن کو تم سننے والوں کے سامنے پیش کرتے ہو۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ تورات اور

انجیل میں آنحضرت علیہ السلام کے لیے جو نصوص وارد ہوئی ہیں وہ نصوص خفیہ ہیں جن کو سمجھنے کے لئے استدلال کی حاجت ہے۔ مگر علمار اہل کتاب ان میں مجادلہ کرتے تھے اور شبہات پیدا کر کے وجہ دلالت کو گم کر دیتے تھے!!

محقق عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی بیضاوی کی شرح میں لکھتے ہیں، "یہ فصل مزید تشریح چاہتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر نبی نے کچھ اشارات اور رموز بیان کئے ہیں جن کو راسخین فی العلم کے سوا کوئی نہیں سمجھتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ علمار کہتے ہیں کہ کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں ہے۔ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ کیا گیا ہو لیکن وہ اشارات میں ہے۔ اگر عوام کے لیے وہ واضح ہوتا تو اس کے کتمان پر صرف علمار کو ملامت نہ کی جاتی پھر ان اشارات کی پوشیدگی ایک زبان سے دوسری زبان میں، عبرانی سے سریانی میں سریانی سے عربی میں منتقل ہونے کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی، تاہم تورات اور انجیل کے جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ ان پر اگر تم غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت پر ایسے اشارات کے ساتھ دلالت کر رہے ہیں جو راسخین فی العلم کے لیے واضح اور عوام کے لیے مخفی ہیں!"

۳:- **اہل کتاب کس کس کے منتظر تھے** | یہ دعویٰ کہ اہل کتاب مسیح اور الیاس کے سوا کسی اور نبی کے منتظر نہیں تھے بالکل باطل ہے۔ اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ علمار یہود جو حضرت عیسیٰ کے معاصر تھے یحییٰ علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ مسیح ہیں جب انہوں نے انکار کیا تو پھر پوچھتے ہیں کیا آپ الیاس ہیں؟ جب انہوں نے اس سے بھی انکار کیا تو آخر میں دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ "وہ نبی" ہیں؟ اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل حضرت مسیح اور الیاس کے سوا ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے اور اس نبی کی شہرت ایسی تھی کہ نام لینے کی بھی حاجت نہ تھی، صرف اشارہ ہی کافی تھا۔

انجیل یوحنا کے ساتویں باب میں حضرت عیسیٰ کا وعظ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

تب ان لوگوں میں سے بہتیروں نے یہ سن کر کہا فی الحقیقت یہی وہ نبی ہے۔ اوروں نے کہا یہ مسیح ہے۔" (آیہ ۴۰-۴۱)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "وہ نبی" مسیح علیہ السلام کے سوا کوئی اور تھا کیونکہ ایک جماعت کہہ رہی ہے کہ یہ مسیح ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ "وہ نبی" ہے۔

مسیح خاتم النبیین نہیں تھے | یہ ادعا کہ مسیح خاتم النبیین تھے اور ان کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہ تھا غلط ہے کیونکہ اوپر تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل ایک اور نبی کے منتظر تھے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، اور جو مسیح اور الیاس کے سوا تھا۔ جب دلائل سے اس نبیٔ موعود کی بعثت قبل مسیح ثابت نہیں ہوئی تو مسیح کے بعد اس کا آنا ضرور ہوا علاوہ بریں خود مسیحیوں کی کتابیں ان کے اس دعوے کا ابطال کر رہی ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد نہ صرف حواریوں اور پولوس کی نبوت کا اعتراف کیا ہے بلکہ وہ ان کے سوا دوسرے انبیا کے بھی قائل ہیں چنانچہ کتاب اعمال کے گیارہویں باب میں ہے۔

انہی دنوں کئی ایک نبی یروشلم سے انطاکیہ میں آئے اور ان میں سے ایک نے جس کا نام اگبس تھا کھڑا ہو کے روح کی ہدایت سے ظاہر کیا کہ تمام مملکت میں بڑا کال پڑیگا جو قلودیوس قیصر کے وقت میں واقع ہوا" (آیہ ۲۷-۲۸)

انجیل کی تصریح کے مطابق یہ سب انبیا ہیں جن میں سے ایک شخص اگبس نے ایک بڑے قحط کی پیشین گوئی کی۔ اسی کتاب کے اکیسویں باب میں پھر لکھا ہے۔

"اور جب ہم وہاں بہت روز رہے، اگبس نامی ایک نبی یہودیہ سے اتر آیا۔ اس نے ہمارے پاس آکے پولس کا کمربند اٹھا لیا اور اپنے ہاتھ پاؤں باندھ کر کہا روح القدس یوں کہتی ہے اس مرد کو جس کا یہ کمربند ہے یہودی یروشلم میں یوں ہی باندھیں گے اور غیر قوموں کے

ہاتھوں میں حوالے کر دیں گے۔ (آیہ ۱۰-۱۱)۔

یہ عبارت بھی مسیح کے بعد اگبس کی نبوت پر گواہی دے رہی ہے۔

مسیحی علما مسیح کے خاتم النبیین ہونے پر اُن کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں جو انجیل متی کے باب ۷، آیہ ۱۵ میں با ین الفاظ نقل کیا گیا ہے۔

"جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے لباس میں آتے پر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں"

مگر اس آیت سے استدلال بھی عجیب ہے مسیح نبی علیہ السلام نے جھوٹے نبیوں سے محترز رہنے کی ہدایت کی ہے نہ کہ سچے نبیوں سے۔ اسی لیے انہوں نے صاف الفاظ میں جھوٹے نبیوں کا لفظ استعمال کیا ہے، ہاں اگر وہ یہ فرماتے کہ ہر اس نبی سے جو میرے بعد آئے بچو تو لحاظ ظاہر یہ قول استدلال کے قابل ہو سکتا تھا اگرچہ پھر بھی ان کو اس کی تاویل ہی کرنی پڑتی کیونکہ پولوس اور حواریین اور اگبس کی نبوت ان کے نزدیک ثابت ہے۔

مسیح کے مذکورۂ بالا قول کا منشا در اصل ان جھوٹے نبیوں سے ڈرانا تھا جو ان کے صعود کے بعد طبقۂ اولیٰ میں بکثرت ظاہر ہوئے۔ یہ بات خود اُن رسائل سے ثابت ہوتی ہے جو عہد جدید میں مندرج ہیں۔ قرنتیون ۲ باب ۱۱ میں ہے

"پر میں جو کرتا ہوں سو ہی کرتا رہوں گا کہ میں ان کو جو قابو ڈھونڈتے ہیں قابو پانے نہ دوں تاکہ جس بات میں وے فخر کرتے ہیں ایسے جیسے ہم ہیں پائے جاویں کیونکہ ایسے لوگ جھوٹے رسول دغاباز کارندے ہیں جو اپنی صورتوں کو مسیح کے رسولوں سے بدل ڈالتے ہیں" (آیہ ۱۲-۱۳)

اس عبارت میں ان کا مقدس پولوس بہ بانگ دہل کہہ رہا ہے کہ اس کے عہد میں جھوٹے

غداروں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور رسل مسیح کے مشابہ ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مقام کی شرح کرتے ہوئے آدم کلارک اپنی تفسیر میں لکھتا ہے :۔

یہ مدعیان نبوت جھوٹے تھے اس دعوے میں کہ ان کو مسیح نے بھیجا ہے۔ ان کا یہ دعوےٰ حقیقت واقعہ کے قطعاً خلاف تھا یہ لوگ وعظ اور اجتہاد کرتے تھے جس سے ان کا مقصد جلب منفعت کے سوا کچھ نہ تھا۔"

یوحنا کے پہلے خطِ عام میں لکھا ہے۔

اے پیارو تم ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وے خدا کی طرف سے ہیں کہ نہیں کیونکہ بہت سے جھوٹے پیغمبر دنیا میں نکل آئے ہیں۔ (باب ۴۔ آیۃ ۱)۔

ان دونوں عبارتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حواریین کے عہد میں بکثرت جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہوگئے تھے اب کتاب اعمال کی حسب ذیل آیات کو بھی دیکھیئے:۔

"اس کے پہلے اس شہر میں شمعون نامی ایک شخص جادوگری کرتا اور سامریہ کے لوگوں کو دنگ رکھتا کہ میں کچھ ہوں اور چھوٹے سے بڑے تک سب اس کی طرف رجوع لاکر کہتے تھے کہ یہ خدا کی بڑی قدرت ہے" (باب ۸ آیۃ ۹-۱۰)

"اور اس تمام ٹاپو میں پافس تک سیر کرکے انہوں نے ایک یہودی جادوگر اور جھوٹے نبی کو جس کا نام بریسوع تھا، پایا۔ (باب ۱۳۔ آیہ ۶)۔

انجیل متی کی آیت ذیل بھی ملاحظہ ہو۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں :۔

خبردار کوئی تمہیں گمراہ نہ کرے کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آویں گے اور کہیں گے کہ میں مسیح ہوں اور بہتوں کو گمراہ کریں گے" (باب ۲۴ آیہ ۴-۵)۔

ان آیات کو مسیح کی اس تنبیہ کے ساتھ جو مدعیان کاذب کے متعلق اوپر نقل کی گئی ہے،

ملاکر دیکھیے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ حضرت نے اپنے پیرؤں کو بہت سے دجالوں اور کذابوں کی خبردی، اور ان کو آگاہ کیا کہ یہ مسیح اور نبی ہونے کا دعوی کریں گے، اور ان کو حکم دیا کہ انہی سے پرہیز کریں نہ کہ خدا کے بھیجے ہوے سچے نبیوں سے۔ چنانچہ جہاں وہ جھوٹے مدعیوں سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں وہیں یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

تم انہیں ان کے پھلوں سے پہچان لوگے کیا کانٹوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔ (متی باب ۷ آیہ ۱۶)۔

اس قول سے انبیاء صادقین کی پہچان بھی معلوم ہوگئی اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے ہیں۔ کیونکہ آپ کے پھل خود آپ کی صداقت پر گواہ ہیں۔ رہے منکرین کے مطاعن تو وہ کسی اعتبار کے قابل نہیں، اگر ان کا اعتبار کیا جائے تو خود حضرت عیسیٰ کب ان سے بچے ہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ یہودی ان کے منکر ہیں، اُن کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک کوئی شخص آنجناب سے زیادہ شریر پیدا نہیں ہوا (معاذ اللہ) اسی طرح بہت سے حکما اور علماء خود مسیحیوں میں ایسے پیدا ہوئے ہیں جو ملت مسیحی سے نکل گئے اور سختی کے ساتھ اس پر طعنہ زن ہوے۔ آج اکناف عالم میں ان کے رسائل بکثرت شائع ہو رہے ہیں اور یورپ میں ان کے متبعین کی تعداد بڑھ رہی ہے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہود اور ان حکما، اور علماء کے طعنے ہمارے نزدیک مقبول نہیں ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اہل تثلیث کے طعنے بھی قطعاً مردود ہیں۔

۵۔ تاویلات یہود اور تاویلات مسیحیہ | مسیحیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انبیاء سابقین کی جو پیش گوئیاں نقل کی ہیں ان کی تفسیر یہودیوں کے ہاں مسیحیوں کی تفسیر سے بالکل مختلف ہے اسی وجہ سے یہودی عیسیٰ علیہ السلام کا بشدت انکار کرتے ہیں مگر علمائے مسیحیت یہودیوں کی ان تفسیروں اور

تاویلوں کی طرف التفات نہیں کرتے، اور اُن کی تفسیر اور تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اُن کے اعتقاد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر راست آجائیں ایک مشہور عیسائی عالم لکھتا ہے :۔

"ملت مسیحیہ کے قدیم معلمین نے صرف یہ دعویٰ او صحیح دعوی کیا ہے کہ جن آیات میں یسوع مسیح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہودیوں نے ان کی غلط اور نامناسب تاویلیں کی ہیں اور انکو خلاف واقعہ طریق پر بیان کیا ہے (میزان الحق فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء صفحہ ۴۶)

اس مصنف کا یہ قول کہ قدمائے ملت مسیحیہ نے فقط یہی دعوی کیا تھا غلط ہے ۔ ان کا دعوی یہ بھی تھا کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں تحریف لفظی کی ہے مگر یہاں میں اس مسئلہ سے قطع نظر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ جس طرح مسیحیوں کے نزدیک آیات مذکورہ کی یہودی تاویلات غلط اور نامناسب ہیں اسی طرح ہمارے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو آیات وارد ہوئی ہیں اُنکی مسیحی تاویلات بھی مردود اور ناقابل قبول ہیں عنقریب آپ دیکھیں گے کہ جو بشارتیں ہم رسول اللہ کی بعثت کے متعلق نقل کرنے والے ہیں ان کی صداقت ان بشارتوں سے زیادہ روشن ہے جو نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نقل کی ہیں پس اگر ہم ان کی تاویلات فاسدہ کیطرف التفات نہ کریں تو کچھ مضایقہ نہیں جس طرح یہودی بعض ان خبروں کے متعلق جو بزعم مسیحیہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کے مسیح منتظر یا کسی اور کے حق میں ہیں یا کسی کے حق میں بھی نہیں ہیں اور مسیحی اُن کو حضرت عیسی کے حق میں قرار دیتے ہیں اور یہودیوں کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے اسی طرح ہم بھی بعض ان خبروں کے بارے میں مسیحیوں کے قول کی پرواہ نہیں کرتے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہیں یہ مسیحی اُن میں سے بعض کو حضرت عیسی پر چسپاں کرتے ہیں مگر آگے چل کر تم دیکھو گے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں ۔ لہذا ہمارا دعوی ان کے دعوے سے زیادہ برحق ہے

۶۔ **حضرت مسیح کے متعلق پیشین گوئیوں پر ایک نظر** | عہد جدید کے مؤلفین کو مسیحی اپنے اعتقاد میں ملہم سمجھتے ہیں

پس ضرور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں جو خبریں انہوں نے نقل کی ہیں وہ بھی ان کے اعتقاد کے مطابق الہامی ہوں۔ اب ہم نمونہ کے طور پر ان پیشین گوئیوں میں سے چند یہاں نقل کرتے ہیں جن کو دیکھ کر ناظرین اندازہ کر سکیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو پیشین گوئیاں ہم آگے نقل کرنے والے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مؤلفین اناجیل کی نقل کردہ پیشین گوئیوں کا کیا مرتبہ ہے پھر اگر کوئی پادری کج بحثی پر اتر آئے اور ان خبروں کی تاویل کرنے لگے جن کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں قرار دیتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ پہلے تو آپ اپنی تاویلات کا رخ ان خبروں کی طرف پھیرئے جو عہد جدید کے مؤلفین نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے نقل کی ہیں۔ ہر منصف مزاج شخص دونوں کا مقابلہ کر کے خود رائے قائم کرلے گا کہ قوت اور ضعف کے اعتبار سے دونوں میں کیا نسبت ہے لیکن اگر وہ عیسوی خبروں کو چھوڑ کر صرف محمدی خبروں کی تاویل پر اصرار کرے تو یہ اس کے عجز اور تعصب پر صریح دلالت کرے گا۔

میں یہاں عہد جدید کے صرف چند اقتباسات پر اکتفا کروں گا کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ بعض قطعی غلط ہیں اور بعض میں تحریف لفظی کی گئی ہے اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر بادعا اور تحکم کے سوا کسی اور طریقہ سے چسپاں نہیں کی جاسکتیں، تو ظاہر ہو جائیگا کہ وہ خبریں جن کے ناقل ملہم بھی نہیں ہیں ان کا پایہ کس قدر گرا ہوا ہے۔ پھر ان کے نقل کی کیا حاجت؟ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

(۵)

تالیف علامۂ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحیؔ مدیر الاصلاح اعظم گڈھ

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد ۷، عدد ۴)

تمام ملتوں پر ملت مسلمہ کی فضیلت ۱۱- یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نماز کو جس طرح تمام عبادات پر فضیلت و تقدم حاصل ہے اسی طرح قربانی پر بھی اس کو فضیلت حاصل ہے۔ اسی لیے بیان میں خدا نے ان کو مقدم رکھا۔ ان دونوں کی باہمی مناسبت پر ہم نے جو تقریر کی ہے اس پر غور کرنے کے بعد اس فضیلت کی وجہ اور ان دونوں کی عظمت بالکل بے نقاب ہو جائے گی۔ اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کوثر کی عظیم الشان نعمت کو ہمارے لیے مخصوص کرنے اور نماز و قربانی کے ایک ساتھ ذکر کرنے سے کیا خاص نتائج نکلتے ہیں:-

۱- ملت مسلمہ کو تمام دوسری ملتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

۲- یہود و نصاریٰ کی توبہ کی قبولیت، اسلام لانے پر منحصر ہے۔

۳- صرف مسلمان حضرت ابراہیم کے وارث ہیں۔

ان امور کے سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

تمام قدیم مذاہب میں خدا کے تقرب کا سب سے بڑا ذریعہ قربانی تھا یعنی ہمارے

یہاں جو رتبہ نماز کو حاصل ہے، وہی رتبہ دوسرے مذاہب میں قربانی کو حاصل تھا یہود کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ انہوں نے نماز کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، اور روزے کا ذکر بھی ان کے ہاں کنایات واشارات کے حجاب میں گم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عقل حقیقی رشد و بلوغ کو نہیں پہنچی تھی، اس لیے مجرد توجہ الی اللہ، جو نماز کی حقیقت ہے، ان کی روحانی تربیت کے لیے کفایت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس ملت میں نماز کو مقدم کرنا اور اس کو دین کا مغز قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ دین نے اپنی ترقی کا قدم، عروج و کمال کے آخری زینہ پر رکھ دیا لیکن یہ اہم نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ طبیعتوں کے مدارج فطرتاً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک قوم علم و حکمت کے ذروۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے، تاہم اس میں بہت سے ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو طفولیت عقلی کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں، اس لیے اسلام نے اگرچہ نماز کو عماد دین قرار دیا اور اپنے اصول میں اس کے لیے جو جگہ مخصوص کی وہ کسی عبادت کو نہ دی، تاہم قربانی کو بالکلیہ نہیں مٹایا حتیٰ کہ اس نے ان قدماء کی یادگار بھی اپنے مراسم میں باقی رکھی جو دین کو محض رہبانیت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے کچھ آثار حج کے مراسم میں باقی ہیں۔

نصاریٰ کا حال یہود کے مراسم میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف نماز ہے۔ قربانی کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اس سے وہ ایک کامل مذہب پر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، کیونکہ کمال اعتدال میں ہے۔ غلو سے کوئی بھلائی وجود میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ اس غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کی اصل بنیاد ایمان کے باب میں وہ یہود سے بھی نیچے گر گئے۔ جس طرح اعمال کے باب میں یہود ان سے پست حالت میں تھے۔

اسی وسط و اعتدال کی رعایت اور ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دینے کے لیے قرآن میں سب سے زیادہ ذکر نماز کا آتا ہے اور "نحر" کا لفظ بجز اس سورۃ کے، پورے قرآن میں کہیں

نہیں آیا ہے۔ جن چند جگہوں پر "تضحیۃ" کا ذکر آیا ہے، وہاں بھی تبعاً آیا ہے۔ پس چونکہ امت مسلمہ کے لیے نماز اور قربانی دونوں عبادتیں یکجا کی گئی ہیں اور خدا نے ان کے فلسفہ اور ان کی عظمت کو پوری طرح ہمارے لیے کھولا ہے، لہذا ہمارے پاس یہ کہنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ اس جامع شریعت کو دوسری تمام شریعتوں اور ملتوں پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

مشرکین اور ملاحدہ کا ذکر نظرانداز کر دینا چاہیے۔ ان کی نماز و قربانی خدا کے لیے نہیں ہے، اس لیے وہ خارج از بحث ہیں۔ باقی رہے یہود و نصاریٰ تو وہ صرف شریعت کے رکن اعظم ہی سے محروم نہیں رہے بلکہ یک قلم دین ہی سے محروم ہو گئے، کیونکہ وہ ایک ایسے مذہب پر قانع ہو گئے جو ایک محدود مدت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نصاریٰ کا مذہب تجرد اور علیحدگی کا مذہب تھا اس میں ہر شخص پر صرف اس کے نفس کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا تھا' اس لیے ان کو جہاد نہیں دیا گیا بلکہ روزہ، نماز اور زکوٰۃ پر رہنے کا حکم ہوا۔ اور ان عبادات کو بھی پوشیدہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ طریقہ اگرچہ ان کی اصلاح و تربیت کے لیے نہایت موزوں تھا لیکن ان کے فرائض و سنن اس اخفاء اور راز داری کے حجاب میں غائب ہو گئے' اور آہستہ آہستہ انہوں نے یہ تمام تعلیمات ضائع کر دیں۔ چنانچہ موجودہ انا جیل روزہ اور نماز کا بحیثیت فرائض کے حکم نہیں دیتیں بلکہ ان کو صرف مستحبات کا درجہ دیتی ہیں اور سعی و تدبیر کسب و محنت اور عوض و انعام کی بالکل مخالف ہیں۔ جب انہوں نے اپنی شریعت کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا (ونسوا حظاً مما ذکروا بہ) اس کی جگہ ان کی بدعات و خرافات نے لے لی۔ چنانچہ ان میں یہ اعتقاد پھیل گیا کہ چونکہ حضرت مسیح اپنی تمام امت کی طرف سے قربان ہو گئے اس لیے قربانی کے حکم کی ذمہ داریوں سے وہ سبکدوش ہو گئے۔ اس خیال میں یہود کی شریعت کے اس حکم کی جھلک ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کسی گناہ کا کفارہ بغیر خون بہائے

نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنا خون بہا کر اپنی تمام امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس عقیدہ کے اختیار کر لینے کے بعد نصاریٰ کے لیے دو باتوں میں سے ایک کا ماننا لازمی ہوگیا۔ اور دونوں کفر و شناعت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ یا تو وہ یہ تسلیم کریں کہ حضرت مسیحؑ نے ان کے مستقبل کے تمام گناہوں کا بھی کفارہ ادا کر دیا، چنانچہ ان کے ایک فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے اور یہ رہبانیت کی بدترین صورت ہے۔ یا یہ مانیں کہ مستقبل کے گناہوں کی مغفرت کی کوئی صورت نہیں ہے، جیسا کہ ان کے ایک فرقہ اور ان کے امام پولوس کا خیال ہے۔ اور یہ معتزلہ کی اس شناعت سے بدرجہا بڑھ کر ہے جس کے وہ رہبانیت کی مفرط مخالفت میں مرتکب ہوئے ہیں۔ یہی ابتری یہود کے ہاں بھی ہے ان کے ہاں دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ بغیر قربانی کے مغفرت نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ ہیکل کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں۔ ان حکموں کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے ہیکل کے نکل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مذہب نے ان پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہی کہ اس نبی موعود (صلعم) پر ایمان لائیں جس کی بعثت سے ان کی تمام آرزوئیں وابستہ کی گئی تھیں۔ اور جس کو پوری طرح ان کے انبیاء نے پہنچوا دیا تھا۔ قرآن مجید میں جس جگہ یہود کو آخری اور کامل شریعت کے ناقابل بتایا گیا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے مغفرت چاہی ہے، وہاں اس وعدہ کا بھی ذکر ہے :۔

قَالَ عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنْ أَشَآءُ وَ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَ الَّذِينَ هُم بِـَٔايَٰتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ	کہا، میں اپنا عذاب جس پر چاہتا ہوں، نازل کرتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کے لیے عام ہے، پس میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ پر قائم رہیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری

يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔

آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ تین لفظوں کی ایک آیت دنیا کے تمام مذاہب وادیان پر بھاری ہے۔ اگر یہودیت ونصرانیت کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اس آیت کو دوسرے میں تو پہلے لفظ کے وزن سے، وہ یہودیت بھاری ہو جائیگی اور دوسرے لفظ کا وزن اس کو نصرانیت پر بھاری کر دے گا، اور چونکہ بقیہ تمام دنیا کی قربانیاں غیر اللہ کے لیے ہیں اور سب نے اللہ واحد کو چھوڑ کر ارباب واصنام بنا لیے ہیں اس لیے بیچ کا عظیم الشان لفظ، اس کا پلہ تمام عالم سے گراں کر دے گا۔ پھر حسن نظم کا اعجاز دیکھیے کہ آپ سے آپ خدا پرستی کی کیسی سیدھی اور صاف راہ باز ہو گئی ہے! یعنی اللہ کی بندگی کی راہ یہ ہے کہ ہر حال میں خدا کی یاد کی جائے اور دل اس کی طرف متوجہ رہے۔ اور زمانہ اور حالت کی رعایت کے ساتھ ہر موزوں شکل میں اس کے سامنے عجز ونیاز کی نذر گزرانی جائے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی وراثت نبی امی صلعم اور ان کے اتباع کی طرف منتقل کر دی اور اس مخصوص وراثت سے یہود ونصاریٰ کو محروم کر دیا۔ اس لیے اُس نماز اور قربانی کا حکم دیا جو اس امت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ظاہر ومنصوص ہے حضرت ابراہیم نے ایک مسجد کی تعمیر کی تھی، کوئی قربان گاہ نہیں بنائی تھی:

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔

میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو

یعنی نماز ہی ان کے دین کی غایت اور اصل واساس تھی۔

باقی رہی قربانی، تو یہ ان کی اور ان کے اطاعت شعار فرزند۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ کی فدویت و جاں سپاری کی یادگار ہے۔ اس لیے اس سنت کے قیام و احیاء کے لیے مقام مروہ مخصوص ہوا، جو حضرت اسمٰعیل کی قربانی کی جگہ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے حجاج بیت اللہ کی قربانی کی یادگار بنا کر اس کو ہمیشہ کے لیے قائم و ثابت کر دیا۔

یہود کی عبادت تمام تر قربانی میں محصور تھی اور یہ بھی ان تمام حقائق و اشارات سے یکسر خالی جن کی طرف قرآن حکیم نے جا بجا رہنمائی کی ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایک شہادت بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ ان کی یہ قربانی حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے اُن کی آسمانی کتاب خود ان کے اس دعوی کی بہ وجوہ تردید کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم مفصل اس کے مقام پر لکھ چکے ہیں

چونکہ صورت معاملہ یہ تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر "نحر" کا لفظ استعمال کیا جو اونٹ کے ذبح کے لئے مخصوص ہے اور اونٹ یہود پر حرام تھا۔ اس بحث کی تفصیلات سورۂ بقرہ اور آل عمران سے متعلق ہیں اس لیے یہاں اجمالی اشارہ کافی ہے یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیے کہ اونٹ کی قربانی میں یہود کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ قربانی صرف ابراہیمی قربانی ہے جو حضرت اسمٰعیل کی اولاد کے لیے مخصوص ہے۔

شَانِئَكَ اور اَلْاَبْتَرُ کی تاویل ۱۲۔ آخری آیہ کی تاویل سے پہلے اس کے دو لفظوں "شانئك" اور "الابتر" پر غور کر لینا چاہیے۔

لفظ "شانی" معرفہ کی طرف مضاف ہو کر خود تعریف کے حکم میں آگیا ہے لیکن معرفہ کے لیے تعین و تشخص لازمی نہیں تاہم بعض مفسرین نے تعیین کرنی چاہی اور چونکہ ان کا مبدا استنباط عام احوال و واقعات ہیں اس لیے جیسا کہ اس حالت میں متوقع ہے، ان کے اقوال مختلف ہو گئے ابن عباسؓ سعید بن جبیرؒ، مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عاصم بن وائل ہے جس نے

کہا تھا "اَنَا شَانِیُٔ مُحَمَّدٍ" میں محمدؐ کا دشمن ہوں شمر بن عطیہ سے روایت ہے کہ یہ عقبہ بن معیط ہے وہ یہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبرؐ کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہے گی۔ ان کی نسل منقطع ہے۔ اسی طرح ابن عباسؓ اور عکرمہؓ کے بعض اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے قریش مراد لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اگرچہ اس لفظ کا مصداق کوئی مخصوص شخص ہونا چاہیے اور آیت کا اولین محمل وہی ہوگا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لے کر اس کی فضیحت نہیں پسند کی تو بہتر یہی ہے کہ ہم بھی تسمیہ وتعیین سے احتراز کریں۔

یہ تفصیلات اس صورت سے متعلق ہیں جب کسی معین شخص کو مراد لیا جائے لیکن جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں معرفت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ مامون راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دیدیجائے اس کا نظم وسیاق جس طرف اشارہ کرے اسی طرف چلنا چاہیے۔ پچھلی سورہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ رجحان کلام قریش کی طرف ہے، تمام قابل اعتماد روایات اسی کی تائید کرتی ہیں۔ پھر حالات وقرائن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس لفظ کے سب سے صحیح مصداق ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پچھلے مباحث کا اقتضا بھی یہی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اولاً اور بالذات اس سے قریش کو مراد لینا چاہیے۔ پھر ہر اس جماعت یا شخص کو جس میں یہ صفت پائی جائے۔ موقع نزول کی خصوصیات کسی لفظ کی وسعتوں کو محدود نہیں کرتیں۔ یہاں اس لفظ کے متعلق اتنی گفتگو کافی ہے۔ آیہ کی تفسیر کے ذیل میں مزید تفصیل ملیگی۔

"ابتر" لفظ بتر سے صفت کا صیغہ ہے "بتر" کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ یہ لفظ مختلف طریقوں سے استعمال ہوا ہے جن پر غور کرنے سے اس معنی کی طرف رہبری ہوتی ہے جو یہاں مراد ہے۔ اس لیے اس مادہ کے مشتقات ہم ان کی معنوی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

سیف باتر، یا بتار، شمشیر بُرّاں کو کہتے ہیں۔ بَتَرَ فُلَانٌ رَحِمَہٗ، فلاں شخص نے رشتۂ رحم کو کاٹ دیا۔ اسی سے اباتر ہے، جس کے معنی قاطع رحم کے ہیں۔ ابتر الرجل کے معنی ہیں دیا پھر رک گیا۔ حجۃ "بتراء" برہان قاطع کو کہتے ہیں۔ قربانی والی حدیث میں ہے۔ انہ نھٰی عن المبتورہ۔ آپ نے دم بریدہ جانور کی قربانی سے منع فرمایا۔ ابتر ایک خاص سانپ کو کہتے ہیں جس کی دم چھوٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح ابتر، اس شخص کو کہتے ہیں جس کی نسل منقطع ہو۔ حدیث میں ہے، کُلّ اَمرٍ ذی بالٍ لَم یُبدأ ببسم اللہ فھوا بتر، جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع کیا جائے وہ ابتر ہے۔ جو خطبہ حمد و صلوٰۃ سے خالی ہو اس کو بتراء کہتے ہیں بتر اس مشک یا ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں لٹکانے کی رسی یا تسمہ نہ ہو۔ "ابتران" گدھے اور غلام کے لیے بولا جاتا ہے۔ سورج کی تمازت اور اس کی شعاعوں کی تابانی جب ماند پڑ جاتی ہے تو اس کو "بتیراء" کہتے ہیں۔

ان تمام مشتقات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ابتر' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اُن تمام چیزوں سے محروم ہو گیا ہو جو ایک شخص کی عزت و عظمت اور قوت و شوکت کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ دیکھو، سورج جب اپنی شعاعوں کی فوج سے الگ ہو کر، اپنے تمام جلال و عظمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی ٹکیا کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے تو اس کو بتیراء، کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اپنے رشتہ رحم کو کاٹ کر، اعوان و انصار کی حمایت سے محروم ہو جائے اس کو ابتر کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے 'اُبتران'، کا لفظ گدھے اور غلام کے لیے بولا گیا کہ قبیلہ میں سب سے زیادہ کم حمایتی انہی کے ہوتے ہیں۔

اس بنا پر قتادہؒ نے ابتر کے معنی 'حقیر و ذلیل' کے بتائے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ مقطوع کے معنی سے چلکر صغیر و قصیر کے معنی میں آیا پھر بے یار و مددگار اور حقیر و ذلیل کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ان دونوں لفظوں کی تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد ہم آیہ

کی تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَر کی تاویل ۱۳۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ 'اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ' ان لوگوں کے جواب میں ہے جنہوں نے آنحضرت صلعم کو بطریق طعن ابتر کہا تھا۔ تمام مفسرین نے ایسا ہی سمجھا ہے۔ ہم کو بھی اس سے پورا اتفاق ہے لیکن اس کہنے سے ان کا مطلب کیا تھا؟ اس کا جواب کسی قدر محتاج تفصیل ہے۔

جب آنحضرت صلعم نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے خیال کیا کہ آپ نے رشتہ رحم کاٹ کر ایک طرف عرب کے معزز ترین خاندان کی تمام عظمتوں سے اپنے کو محروم کر لیا اور دوسری طرف تولیتہ کعبہ" اور اس کی ہمجواری کی جو عزت وسعادت اس خاندان کے واسطے سے آپ کو حاصل تھی، وہ بھی اپنے ہاتھوں برباد کر دی۔ اس کے بعد آپ کی حیثیت ان کی نظر میں محض ایک شاخ بریدہ کی تھی جو اپنے تنہ سے الگ ہو کر خشک اور فنا ہو جانے کے لیے چھوڑ دی گئی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو برکت و کثرت اور فتح و نصرت کی بشارت دی کہ آپ کے دشمنوں کا خیال بالکل غلط ہے خود وہی بے یار و مددگار اور تباہ و برباد ہونگے؛ اور چونکہ یہ بات ان کے خیال کی تردید میں کہی گئی ہے اس لیے اس میں ایک لطیف تعرض بھی ہے کہ آپ کے اعداء جس عزت پر آج فخر کر رہے ہیں وہ عنقریب ان سے چھن جائے گی۔ اس پہلو سے اس آیت میں فتح مکہ کی بشارت ہے۔

لغت اور نظم کلام کے علاوہ روایات سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے امام سیوطی رح کہتے ہیں:۔

"بزار وغیرہ نے بسند صحیح ابن عباس سے تخریج کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ کعب بن اشرف مکہ آیا قریش نے اس سے کہا 'تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ اس شخص کو دیکھتے ہو

جو اپنی قوم سے کٹ کر علٰحدہ ہو گیا ہے۔ اور پھر بھی اپنے تئیں ہم سے افضل خیال کرتا ہے! حالانکہ حجاج کے نگران ان کو پانی پلانے والے اور خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی ہم ہیں۔

کعب نے جواب دیا تم اس سے افضل ہو۔ اس پر" اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الاَبتَرُ والی آیت اتری"۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں تخریج کی ہے کہ" ابن المنذر عکرمہ سے راوی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے مشرف فرمایا۔ قریش نے کہا کہ محمد ہم سے کٹ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان شانئك الخ والی آیہ نازل فرمائی"

امام احمد وغیرہ نے اسی مضمون کی روایتیں تخریج کی ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔

بعینہ اسی مضمون کی ایک روایت ابن جریر نے تخریج کی ہے جو ابن عباس سے مروی ہے کہ جب کعب بن اشرف مکہ آیا تو قریش اس سے ملے اور کہا کہ ہم حجاج کو پانی پلاتے ہیں اور کعبہ کے کلید بردار ہیں۔ تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ بتاؤ ہم بہتر ہیں یا یہ شخص جو اپنی قوم سے کٹ کر علٰحدہ ہو گیا ہے اور اپنے کو ہم سے افضل خیال کرتا ہے! اس نے کہا تم افضل ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان شانئک الخ والی آیت نازل فرمائی اور اسی موقع پر یہ آیۃ بھی نازل ہوئی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ اُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا	کیا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جن کو کتاب آسمانی کا ایک حصہ ملا ہے اور وہ جبت وطاغوت پر ایمان لاتے ہیں اور کفار سے کہتے ہیں کہ تم لوگ مسلمانوں سے زیادہ راہ یاب ہو۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی پھٹکار ہے اور جن پر خدا کی پھٹکار ہوئی تم ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔

بعینہ اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت عکرمہؓ سے بھی ہے۔ صرف وعند نا صحن المدین کے الفاظ زیادہ ہیں۔

یہ تمام روایتیں، تقریباً ہم معنی ہیں۔ قریش کو اپنے خاندانی شرف و اصالت نیز بیت اللہ کی ہمجواری و خدمت اور قربانی پر بڑا ناز تھا۔ وہ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت سمجھتے تھے، اس لیے ان کو خیال ہوا کہ جو شخص ان سے علیحدہ ہوگیا وہ اس شاخ بریدہ کے مانند ہے جس کا خشک ہوکر فنا ہوجانا یقینی ہے۔ وہ اپنے اس گمان میں مگن تھے اور یہودی سردار کی تائید نے اس کو مزید قوت دیدی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کردی کہ جو خیال تم پیغمبر عالم صلعم کے متعلق قائم کر رہے ہو، وہ بالکل غلط ہے۔ البتہ تم عنقریب مخذول و مقہور رہو گے۔ اور وہ تمام نعمتیں جو تم کو خانہ کعبہ کی تولیت کے صلہ میں ملی تھیں تمہاری شرارتوں اور بدعہدیوں کی پاداش میں تم سے چھین لی جائیں گی۔ چنانچہ سورہ براءۃ کے نزول نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو صحیح کردیا اور خانہ کعبہ سے مشرکین کا رشتہ یک قلم منقطع کر دیا گیا۔ یہاں یہ مجمل اشارات کافی ہیں۔ پندرھویں فصل میں اس کے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی۔

سورۃ کا موقع نزول اور فتح مکہ کی بشارت ہم پچھلی فصلوں میں گذر چکا ہے کہ یہ سورۃ فتح مکہ کی بشارت ہے اور "انا اعطینٰک" میں ماضی کا صیغہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ وعدہ فتح عنقریب پورا ہونیوالا ہے۔

قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات میں، اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم کو صبر و انتظار کا حکم دیا ہے۔ اور فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے لیکن ہر آیت میں ایک قسم کا ابہام ہے۔ مثلاً۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ۔

ہم ان کو جس چیز کی دھمکی دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو تم کو دکھادیں گے یا دکھانے سے پہلے تم کو اٹھالیں گے۔ تمہارے اوپر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے، حساب کا تعلق ہم سے ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ مُقْتَدِرُونَ ۔

یا تو ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ہم ان سے انتقام لیں گے یا تمہیں دکھائیں گے وہ چیز جس کی ہم نے ان کو دھمکی دی ہے کیونکہ ہم کو ان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے

ان آیتوں سے صاف نہیں کھلتا تھا کہ آں حضرت صلعم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ ہوگا؟ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح نصرت الٰہی کے ظہور سے پہلے وفات پائیں گے یا حضرت نوح علیہ السلام کی طرح غلبہ و نصرت ربانی کا جلال دیکھ کر، یا ان دونوں سے الگ آپ کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سا معاملہ پیش آئے گا۔ جن کو فتح و نصرت کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں میں دکھا دیا گیا لیکن اس کے کامل ظہور کا وعدہ آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا، اس لیے مسلمان ایک صاف و صریح وعدہ کے لیے بیقرار تھے۔ اس آیت نے نازل ہو کر مسلمانوں کو فتح و نصرت کی خوش خبری سنائی اور جو بات اب تک اخفا، و ابہام کے حجاب میں گم تھی بے نقاب ہو کر سامنے آگئی۔

اس لیے قیاس یہ ہے کہ یا تو یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا پہلی فتح یعنی صلح حدیبیہ کے روز نازل ہوی ہے۔ روایات سے بھی ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں مندرجہ ذیل روایات نقل کی ہے۔

"سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ "فصل لربك وانحر" والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوی۔ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کر کے لوٹ جاؤ۔ آنحضرت اٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی اور قربانی کی اسی وقت حضرت جبرئیل نے فصل لربك وانحر کا پیام دیا"

امام سیوطی نے یہ حدیث نقل کر کے لکھا کہ "اس میں سخت غرابت ہے" لیکن اس غرابت کی

کوئی وجہ نہیں بیان کی ہے۔ چونکہ یہ روایت مختلف وجوہ سے مشہور خیال کے مخالف نظر آئی اس لیے انہوں نے وجہ غرابت کی تشریح ضروری نہیں سمجھی۔ حالانکہ جن اسباب سے ان کو یہ وہم ہوا، وہ غور وتامل کے بعد بالکل بے حقیقت ہو جاتے ہیں ہم اجمالاً ان کو یہاں بیان کر دیتے ہیں تاکہ ان کے ضعف کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) انھوں نے خیال کیا کہ یہ سورۃ مکی ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے بعد پیش آیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ علماء نے تصریح کر دی ہے کہ جو سورتیں ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئی ہیں، وہ بھی مکی کہلاتی ہیں۔ حدیبیہ مکہ سے بالکل قریب ہے دونوں کے درمیان صرف ایک منزل کی مسافت ہے اور حدیبیہ اور مدینہ کے درمیان نو منزلوں کی مسافت ہے۔ حدیبیہ حرم میں داخل ہے۔

۲۔ دوسرا شبہہ یہ ہوا کہ حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے ۵ سال ۸ مہینے کے بعد پیش آیا اور کعب بن اشرف ہجرت کے تیسرے سال قتل ہوا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ "ان شانئک ھو الابتر" اس کے اس سوال کے جواب پر نازل ہوئی ہے جو قریش نے اس سے پوچھا تھا اور جس کی تفصیل پہلی فصل میں گذر چکی ہے۔ اس لیے اس سورہ کا حدیبیہ کے موقع پر اترنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ جب کسی آیت کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے موقع پر اتری تو اس کا مطلب کوئی تعین و خصوص وقت نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص حالت کے ساتھ آیۃ کی مطابقت ظاہر کرنی مقصود ہوتی ہے اس لیے ان شانئک ھو الابتر سے وہ تمام جماعتیں مراد ہوں گی جو آنحضرت صلعم کی دشمن ہوں خواہ وہ فنا ہو چکی ہوں یا قیامت تک ظاہر ہوتی رہیں۔ اس آیۃ کے نزول کے وقت تک آپ کے جو اعداء ذلت و نامرادی کی موت مر چکے تھے وہ گویا سب باقی رہ جانے والے دشمنوں کے لیے مثال و عبرت تھے۔ کعب سے گفتگو کرنے کے بعد یہ نہیں ہوا تھا کہ قریش نے آنحضرت صلعم کے بارہ میں

اپنا فیصلہ بدل دیا ہو بلکہ اس شریر نے جو کچھ ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا وہی ان کا اذعان واعتقاد تھا لیکن جب نصرت الٰہیہ کے ظہور نے آپ کے تمام اعداء کو پامال کر ڈالا تو مجبوراً ان کو اپنا یقین بدلنا پڑا۔ پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قریش کے متعلق ہے، جو کعب کے فریب میں آئے تھے، ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ آیت ان کے حال سے بالکل مطابق ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے طعنہ کا جواب دیا اور ذرا بھی توقف نہیں فرمایا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس آیہ میں "شانی" سے 'عقبہ بن مُعَیط' کو مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اس نے آنحضرت صلعم کو طعنہ دیا تھا کہ آپ کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی اس لیے آپ 'ابتر' ہیں۔ عقبہ بدر میں قید ہوا اور بدر کے جو قیدی قتل ہوئے ان کے ساتھ قتل کیا گیا لیکن یہ وجہ بھی کوئی قوی وجہ نہیں ہے۔ دوسری وجہ کی تردید میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی تردید کے لیے بھی کافی ہے۔ پھر اس آیت کی صحیح تاویل اس طعن سے بالکل بے تعلق ہے، ابتر سے یہاں منقطع النسل یا لاولد مراد نہیں ہے یہ تاویل بالکل سخیف ہے۔ نظم بھی اس سے ابا کرتا ہے اور روایت کی طرف سے بھی اس میں ضعف ہے۔ اس لیے سعید بن جبیر کے قول میں کوئی غرابت نہیں ہے بلکہ حق بات یہی ہے۔

اس سورہ کی اوپر والی دو آیتوں کی تفسیر میں محمد بن کعب قرظی سے جو قول مروی ہے اس سے بھی سعید بن جبیر کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بہت سے لوگ غیر اللہ کے لیے عبادت و قربانی کرتے تھے پس اے محمد جب ہم تم کو کوثر بخشیں تو تمہاری نماز و قربانی صرف ہمارے لیے ہوتی چاہیے۔"

وہ گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قریش کوثر کی عظیم الشان نعمت پاکر بھی محروم ہی رہے کیونکہ انہوں نے اس نعمت کی قدر نہیں پہچانی اور اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ان سے چھین کر تم کو بخشی۔ پس جب ہم اس کو تمہیں دیدیں، اور گویا دے چکے تو تم اس کا

حق ادا کرو۔

یہ مسلم ہے کہ جب کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دیا جائے "جو کسی واقع ہونے والی بات پر متفرع ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بات یا تو واقع ہو چکی ہے یا عنقریب واقع ہونے والی ہے۔ چنانچہ جب سورہ بقر اتری تو لوگوں نے اس کے مضمون سے یہی سمجھا کہ اس کا نزول ظہور فتح وغلبہ اسلام کے وقت ہوا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی محمد بن کعب کے قول "جب ہم تم کو کوثر بخشیں" کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہم نے تم کو بخش دیا اور اس وعدہ کے ظہور کا وقت قریب آگیا ہے۔

(باقی)

مرأۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین اڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشاء جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کیلئے ایسی سہولت مہیا کردی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کرسکتا ہے۔

کاغذ کتابت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت سکہ انگریزی للعہ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

تفسیر سورۂ ماعون

از جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی

اَرَءَیْتَ۔ کیا تونے دیکھا۔ یہ جملہ بمعنے اخبرنی ہے یعنے یہ تو بتاؤ کہ ایسے شخص کا کیا حال ہے

اَلَّذِیْ۔ اس شخص کو جو۔ الذی مثل ال کے کبھی جنس کے لیے آتا ہے بمعنے "ہر ایک شخص جو" اور کبھی عہد کے لیے آتا ہے اور اس سے خاص شخص مراد ہوتا ہے یعنے اس شخص کو جس کو تم جانتے ہو"

یُکَذِّبُ۔ کَذَبَ یَکْذِبُ کَذِبًا و کِذْبًا مثل ضرب جھوٹ کہنا۔ کذّب یُکَذِّبُ تَکْذِیبًا باب تفعیل سے جھٹلانا۔ جھوٹا سمجھنا۔

اَلدِّیْن۔ مذہب۔ اسلام۔ بدلہ و جزاء۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ۔ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو جزاء اور روز قیامت کا منکر ہے۔ اس کو یقین نہیں کہ جو جیسا کریگا ویسا پائیگا، عمل ور دعمل برابر ہوتے ہیں

سیاق آیات اور عبارت کے تسلسل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سورت میں کسی بخیل منافق کی حالت بیان کی گئی ہے کہ مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہئے۔

یَدُعُّ۔ دھکیلتا ہے۔ دھکے دے کر نکالتا ہے۔ گردنی دیتا ہے۔

اَلْیَتِیْم بے باپ کا۔

ایک عام غلطی لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ یتیم و یسیر جس کا باپ ہو نہ ماں ہو یسیر کوئی لفظ نہیں ہے قرآن شریف میں ایک جگہ ہے یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا۔ یعنی یتیم اور قیدی۔ یاروں نے اسیر سے یسیر بنالیا یعنے جس کی ماں نہ ہو۔

فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ۔ یہ شخص جزا کا یقین نہ رکھنے ہی کی وجہ سے ایسا بے رحم تنگ دل ہوگیا ہے کہ غریب یتیم کو دھکے دے دے کر نکال دیتا ہے۔

يَحُضُّ مثل يَمُدُّ۔ ترغیب دیتا ہے۔ برانگیختہ کرتا ہے۔ یحث، یحرص، یرغب۔

طعام جو چیز کھائی جائے۔ طَعِمَ مثل سمع طعمًا وطعامًا کھانا و طُعْمًا چکھنا و طَعَمَ مثل فتح، سیر ہونا۔

مسکین سَکَنَ الرَّجُلُ يَسْکُنُ سُکُونًا مثل نصر و سَکُنَ يَسْکُنُ سُکُونَۃً مثل کرم۔ وتسکن۔ باب تفعل سے و تَمَسْكَنَ باب تفعیل سے مسکین و فقیر ہوا مِسْكِين ومَسْكِين جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ یا جو کچھ ہو وہ کافی نہ ہو۔ اور ذلیل وضعیف عورت کو مسکین ومسکینہ دونوں کہتے ہیں۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ اور مسکین کو آپ کھلانا تو ایک طرف رہا لوگوں کو بھی اس کے کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

وَيْلٌ۔ افسوس ہے۔ خرابی ہے۔ تباہی ہے۔

ماہون۔ سہا یسہو سہوًا مثل دعا۔ بھولنا۔ سَهَا عَنِ الصَّلوٰۃ وفیہا۔ میں کیا فرق ہے۔ سہا عن الصلوٰۃ۔ بھول کر غفلت کرکے نماز چھوڑ دی۔ یا قضا کر دی اور بے وقت ادا کی۔ سہا فی الصلوٰۃ نماز میں کچھ بھول گیا۔ معمولی آدمیوں کو وسوسہ شیطانی سے اور بزرگوں کو کمال حضور سے تعداد رکعات وغیرہ کی بھول ہوتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کئی دفعہ نماز میں سہو ہوا ہے مگر کہاں غفلت کی بھول اور کدھر کمال حضور کا سہو۔ ؎ کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُونَ۔ افسوس ہے ان

نمازیوں پر جو غفلت کرکے یا تو نماز ہی نہیں پڑھتے یا پڑھتے بھی ہیں تو بے وقت پڑھتے ہیں۔ اس سے پہلے منافقوں کا معاملہ مخلوق کے ساتھ بتایا گیا تھا۔ اس آیت میں ان کا معاملہ خالق سے بتایا گیا ہے۔ پہلے صرف ایک شخص سے بحث کی گئی پھر اس کے ساتھ اس کے ہم رنگ منافقوں کو بھی ملا لیا گیا۔ اور فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ بصیغہ جمع کہا گیا۔

يُرَاءُوْنَ - رَاءٰى يُرَائِيْ مُرَاءَاةً وَرِيَاءً - ریا کرتے ہیں۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کا مقصد امتثال امر الٰہی نہیں۔ لوگوں میں اپنے تقوی کی شہرت مطلوب ہے چونکہ یہ شخص کام کرتا ہے۔ اور لوگ تعریف کرتے ہیں، اس لیے باب مفاعلہ لایا گیا ہے۔ ریا، حقیقۃً ایک قسم کا شرک خفی ہے۔ ریا سے اعمال ضائع جاتے ہیں۔ اس کا اصلی وقت ابتداءً ہے۔ نیت کا پاک، خالص خدا کے لیے رکھنا اصل ہے تنہا نماز میں اور امام بن کر حسن طمانیت اور قراءت سے نماز پڑھائی جاتی ہے۔ فرق کا پیدا ہونا قابل توجہ ہے۔ جس عبادت سے رضا رحق مقصود ہوتی ہے اس کا ثواب حق تعالیٰ سے ملے گا۔ جس عبادت سے رضا مخلوق مطلوب ہوتی ہے، اس کا بدلہ حق جل وعلیٰ سے کیونکر مل سکتا ہے۔ خدا کے بندے ہو تو خدا کے لیے عمل کرو۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ۔

ماعُوْن - مَعَنَ الْمَاءُ يَمْعَنُ مَعْنًا فَهُوَ مَعِيْنٌ۔ باب فتح سے جاری ہوا، بہا۔ الماعون۔ احسان۔ پانی۔ زکوٰۃ، وہ چیزیں جو عادتاً مستعار یا مفت دی جاتی ہیں۔ جیسے ہانڈی۔ کلہاڑی۔ آگ۔ پانی۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ - وہ جو نماز پڑھتے ہیں تو ریا کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ تو دیتے ہی نہیں۔

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۴)

اب تک سود کے مسئلہ پر جو بحث کی گئی ہے وہ صرف ایک اصولی بحث تھی اب ہم اس کے تعلقات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم ان شبہات کو بھی رفع کریں گے جو ڈاکٹر سیادت علی صاحب نے اپنے خطبہ میں بیان کئے ہیں اور جو ہمارے سابق مضامین کو دیکھ کر بعض دوسرے حضرات نے پیش کیے ہیں۔

ربا الفضل | ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ربوٰ در اصل اُس زیادتی کو کہتے ہیں جو راس المال سے استفادہ کی مہلت دینے کے معاوضہ میں وصول کی جاتی ہے۔ اصطلاح شرع میں اس کو "ربا النسیئۃ" کہا جاتا ہے یعنی وہ ربوٰ جو قرض کے معاملہ میں لیا اور دیا جائے۔ قرآن مجید میں اسی کو حرام کیا گیا ہے، اس کی حرمت پر تمام امت کا اتفاق ہے اور اس میں کبھی کسی شک وشبہہ نے راہ نہیں پائی ہے۔

لیکن شریعت اسلامی کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس چیز کو حرام کیا جاتا ہے اس کی طرف جانے کے جتنے راستے ممکن ہیں ان سب کو بند کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی ابتدا جس مقام سے ہوتی ہے وہیں روک لگا دی جاتی ہے تاکہ انسان اس کے قریب بھی نہ جانے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدے کو ایک لطیف مثال میں بیان فرمایا ہے۔ عرب کی اصطلاح میں حِمٰی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص نے اپنے لیے مخصوص کر لی ہو اور

جس میں دوسروں کے لیے اپنے جانور چرانا ممنوع ہو۔ حضور فرماتے ہیں کہ ہر بادشاہ کی ایک حمی ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی حمی اس کے محارم ہیں۔ جو جانور حمی کے اردگرد چرتا پھرتا ہے، بعید نہیں کہ کسی وقت چرتے چرتے وہ حمی کے حدود میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمی یعنی اس کے محارم کے اطراف میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس کے لیے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ کب اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ حرام میں مبتلا ہو جائے۔ لہٰذا جو امور حلال و حرام کے درمیان واسطہ ہیں ان سے بھی پرہیز لازم ہے تاکہ تمہارا دین محفوظ رہے یہی مصلحت ہے جس کو مد نظر رکھکر شارع حکیم نے ہر ممنوع چیز کے اطراف میں حرمت اور کراہیت کی ایک مضبوط باڑھ لگا دی ہے، اور ارتکاب ممنوعات کے ذرائع پر بھی ان کے قرب و بعد کے لحاظ سے سخت یا نرم پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ آگے چل کر پردہ کی بحث میں ہم اس قاعدہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یہاں اظہار مدعا کے لیے صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

سود کے مسئلہ میں ابتدائی حکم صرف یہ تھا کہ قرض کے معاملات میں جو سودی لین دین ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ اسامہ بن زید سے جو حدیث مروی ہے۔ اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ انما الربا فی النسیئۃ - وفی بعض الالفاظ لا ربا الا فی النسیئۃ - یعنی سود صرف قرض کے معاملات میں ہے[1] لیکن بعد میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس حمی کے اردگرد بھی بندشیں لگانا ضروری سمجھا تاکہ لوگ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔ اسی قبیل سے وہ فرمان نبوی ہے جس میں سود کھانے اور کھلانے کے ساتھ سود کی

[1] حضرت عبداللہ ابن عباس نے ابتدا میں اسی حدیث کی بنا پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ سود صرف قرض کے معاملات میں ہے نقد میں نہیں ہے لیکن جب بعد میں ان کو متواتر روایات سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے نقد معاملات میں بھی تفاضل کو منع فرمایا ہے تو انہوں نے اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رجع ابن عباس عن قولہ فی الصرف و عن قولہ فی المتعۃ - اسی طرح حاکم نے حیان العدوی کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے بعد میں اپنے سابق فتوے پر توبہ و استغفار کی اور نہایت سختی کے ساتھ ربا الفضل سے منع کرنے لگے۔

دستاویز لکھنے اور اس پر گواہی دینے کو بھی حرام کیا گیا ہے۔ اور اسی قبیل سے وہ احادیث ہیں جن میں ربوا الفضل کی تحریم کا حکم دیا گیا ہے۔

ربوٰا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا، کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سودخواری ہے۔ چنانچہ حضور نے خود ہی اس مصلحت کو اس حدیث میں بیان فرما دیا ہے جس کو ابوسعید خدری نے بدین الفاظ نقل کیا ہے کہ لاتبیعوا الدرھم بدرھمین فانی اخاف علیکم الرما (والرماھوالربا) یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سودخواری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

ربا الفضل کے احکام سود کی اس قسم کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام منقول ہیں ان کو یہاں لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے۔

عبادہ بن صامت کی حدیث جو بخاری کے سوا تمام صحاح میں آئی ہے۔

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ یداً بیدٍ فاذا اختلفت ھذہِ الاجناس فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ۔

سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا مبادلہ چاندی سے، گیہوں کا مبادلہ گیہوں سے، جو کا مبادلہ جو سے، کھجور کا مبادلہ کھجور سے، نمک کا مبادلہ نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ مثل بمثل اور برابر برابر اور دست بدست ہو۔ البتہ اگر جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

ابو بکرہؓ کی حدیث جس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔

لاتبیعوا الذھب بالذھب الا سواء — سونے کو سونے کے عوض نہ فروخت کرو مگر برابر برابر

بسواءٍ والفضۃ بالفضۃ الا سواءً بسواء — اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ فروخت کرو مگر برابر برابر

وبیعوا الذھب بالفضۃ والفضۃ — البتہ سونے کو چاندی کے عوض اور چاندی کو سونے

بالذھب کیف شئتم — کے عوض جس طرح چاہو بیچو۔

عبادہ بن صامت کی دوسری حدیث جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات

ینھیٰ عن الذھب بالذھب والفضۃ — سے منع کرتے سنا ہے کہ سونے کا سونے سے اور چاندی

بالفضۃ والبر بالبر والشعیر — کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جو کا جو سے

بالشعیر والتمر بالتمر والملح — اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے مبادلہ کیا

بالملح الا سواءً بسواءٍ عینا بعین — جائے مگر اس طرح کہ مبادلہ برابر برابر اور عین بعین

فمن زاد او ازداد فقد اربیٰ۔ — ہو۔ جس نے زیادہ لیا اس نے سود لیا۔

عبداللہ ابن عمر کی حدیث جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے۔

الذھب بالذھب ربا الا ھاء — سونے کا مبادلہ سونے سے سود ہے الا یہ کہ دست

وھاء والورق بالورق ربا الا ھاء — بدست ہو۔ اور چاندی کا مبادلہ چاندی سے گیہوں

وھاء والبر بالبر ربا الا ھاء وھاء — کا مبادلہ گیہوں سے، جو کا مبادلہ جو سے کھجور کا مبادلہ

والشعیر بالشعیر ربا الا ھاء و — کھجور سے سود ہے الا یہ کہ دست بدست ہو۔

ھاء والتمر بالتمر ربا الا ھاء وھاء

ابو سعید خدری کی حدیث جس کو ابو حنیفہ نے روایت کیا ہے۔

الذھب بالذھب مثل بمثل یدا بید — سونے کا مبادلہ سونے سے مثل بمثل دست بدست ہونا

والفضل ربا والفضة بالفضة مثل بمثل يد بيد والفضل ربا وهكذا قال إلى اخر الستة۔

چاہئیے اور جو زیادہ ہے وہ سود ہے، اور چاندی کا مبادلہ چاندی سے مثل بمثل دست بدست ہونا چاہیے اور جو زیادہ ہے وہ سود ہے۔ اسی طرح بقیہ چار اشیاء کے متعلق بھی آپ نے ایسا ہی فرمایا۔

ابوداؤد میں ہے۔

ولا باس ببيع الذهب بالفضة والفضة اكثرهما يداً بيد واما نسيئة فلا ولا باس ببيع البر بالشعير والشعير اكثرهما يداً بيد واما النسيئة فلا

اور کوئی حرج نہیں اگر سونے کو چاندی کے عوض بیچا جائے اور چاندی زیادہ ہو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں اور کوئی حرج نہیں اگر گیہوں کا مبادلہ جو سے ہو اور جو زیادہ ہوں بشرطیکہ مبادلہ دست بدست ہو جائے۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں۔

احکام بالا کا ماحصل ان احادیث کے الفاظ اور مقاصد پر غور کرنے سے حسب ذیل اصول اور احکام حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ جب دو چیزیں ایک ہی جنس اور ایک ہی قدر کی ہوں (یعنی مثل بمثل اور عین بعین ہوں) تو ان کا مبادلہ تفاضل (کمی و بیشی) کے ساتھ نہیں ہو سکتا، خواہ نقد ہو یا نسیہ۔ مثلاً ایک تولہ سونے کا مبادلہ اسی عیار کے ایک تولہ ایک رتی سونے کے ساتھ جائز نہیں۔ مبادلہ اگر ہو سکتا ہے تو ایک ہی تولہ سونے کے ساتھ (سوائے بواہ) ہو سکتا ہے۔

۲۔ اگر جنس ایک ہو لیکن قدریں مختلف ہوں تو ان میں تفاضل جائز ہے، مگر قرض جائز نہیں اس صورت میں تفاضل کے ساتھ دست بدست مبادلہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک سونا ۲۲ قیراط کے عیار کا ہے۔ اور دوسرا سونا ۲۰ قیراط کے عیار کا، تو ان کے مبادلہ میں عرف کے لحاظ سے تفاضل

جائز ہے، مگر معاملہ دست بدست (یداً بید) ہونا چاہیے۔ قرض کی صورت میں یہ شبہ واقع ہو سکتا ہے کہ تفاضل کی مقدار مقرر کرنے میں مہلت کا بھی اعتبار کر لیا گیا ہو۔

۳۔ اگر قدر ایک ہو اور جنسیں مختلف ہوں تب بھی تفاضل جائز ہے مگر قرض جائز نہیں۔ مثلاً ایک تولہ سونا ایک سیر چاندی کے برابر قدر رکھتا ہے تو دونوں میں مبادلہ ہو سکتا ہے، مگر دست بدست۔ نسیہ میں وہی شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ اگر جنس اور قدر دونوں میں اختلاف ہو تو تفاضل بھی جائز ہے اور قرض بھی۔ مثلاً ایک طرف نمک ہے اور دوسری طرف گیہوں ہیں۔ ان دونوں میں تفاضل کے ساتھ مبادلہ بھی ہو سکتا ہے اور نسیہ بھی لیکن اگر نسیہ کی صورت میں تفاضل کی مقدار اتنی رکھی جائے جتنی نقد کی صورت میں نہ ہوتی تو یہ سود ہو جائے گا۔

۵۔ اتحاد جنس کے ساتھ اگر نوعیت اور قدر بدل جائے تو مبادلہ میں تفاضل بھی ہو سکتا ہے اور نسیہ بھی۔ مثلاً ایک طرف خالص سونا ہے اور دوسری طرف سونے کی بنی ہوئی کوئی چیز، یا ایک طرف گیہوں ہیں اور دوسری طرف گیہوں کا آٹا ہے۔ ان صورتوں میں اگرچہ جنسیں مشترک ہیں، لیکن محنت اور عمل کے شمول سے ان کے درمیان جنسی مماثلت باقی نہیں رہی اور قدر میں بھی اختلاف ہو گیا۔ یہی نوعیت زر مسکوک کی بھی ہے۔ اس کا چلن محض اس کی فضیت یا طلائیت کے اعتبار سے نہیں ہوتا بلکہ مسکوکیت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اس لیے سونے یا چاندی کے ساتھ اس کا مبادلہ تفاضل کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر مبادلہ میں مسکوکیت کا اعتبار ساقط ہو کر صرف فضیت یا طلائیت کا اعتبار باقی رہ جائے تو اس پر وہی احکام جاری ہوں گے جو سونے اور چاندی پر ہوتے ہیں۔

۶۔ اگر زر مسکوک معیار مبادلہ قرار پا جائے اور اشیاء کی قیمتیں اسی کے لحاظ سے

متعین ہوں تو پھر شے کا مبادلہ شے کے ساتھ اس کے وزن یا پیمانہ کے لحاظ سے نہ ہوگا بلکہ زر مسکوک کے معیار پر ان دونوں کی قیمتوں کے لحاظ سے ہوگا۔ مثلاً ایک قسم کے گیہوں روپے کے دس سیر ہیں، اور دوسری قسم کے گیہوں روپے کے آٹھ سیر ہیں تو ان کے درمیان اتحاد جنس کے باوجود تفاضل کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے، کیونکہ اب اصل اعتبار ان کے وزن کا نہیں بلکہ ان کی قیمتوں کا ہے۔ اس صورت میں اگر تعین قیمت کے لحاظ سے قرض پر بھی معاملہ ہو تو جائز ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ایک روپیہ کے گیہوں قرض لیتا ہے جبکہ گیہوں کا نرخ دس سیر فی روپیہ ہے اور ایک مہینہ بعد وہ ایک روپیہ اس کو واپس دیتا ہے جبکہ گیہوں کا نرخ ۱۲ سیر فی روپیہ ہو گیا، یا آٹھ سیر فی روپیہ رہ گیا۔ جنس شے میں یہ تفاضل سود کی تعریف میں نہ آئے گا۔ کیونکہ اس صورت میں دراصل معاملہ کی نوعیت یہ ہوگی کہ اس نے روپیہ کے بدلے میں روپیہ ادا کیا۔ مگر یہ اسی وقت جائز ہے جبکہ معاملہ میں اعتبار جنس شے کا نہیں بلکہ قیمت شے کا ہو۔

حضرت عمر کا قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام مجمل ہیں اور معاملات کی تمام جزئی صورتوں کی ان میں تصریح نہیں ہے، اس لیے بہت سے جزئیات ایسے پائے جاتے ہیں جن میں شک کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ ربوٰ کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ یہی بات ہے جس کی طرف حضرت عمر نے اشارہ کیا ہے کہ:۔

ان آیۃ الربا من آخر ما نزل من القرآن وان النبی صلعم قبض قبل ان یبینہ لنا فدعوا الربا والریبۃ	آیت ربوٰ قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو آخر زمانہ میں نازل ہوئی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا قبل اس کے کہ آپ اس کے

تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہذا تم اس چیز کو بھی چھوڑ دو جو یقیناً سود ہے۔ اور اس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔

فقہاء کے اختلافات | احکام کا یہ اجمال ہی ان اختلافات کا مبنیٰ ہے جو اجناس ربویہ کے تعین، اور ان میں تحریم کی علت، اور حکم تحریم کے اجراء میں فقہائے امت کے درمیان ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ربوٰ صرف اُن چھ اجناس میں ہے جن کا ذکر نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یعنی سونا چاندی گیہوں، جو خرما اور نمک۔ ان کے سوا دوسری تمام چیزوں میں تفاضل کے ساتھ بلا کسی قید کے لین دین ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب قتادہ، اور طاؤس، اور عثمان البتی، اور ابن عقیل حنبلی اور ظاہریہ کا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم تمام ان چیزوں میں جاری ہوگا جن کا لین دین وزن اور پیمانہ کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ یہ عمار اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، اور ایک روایت کی رو سے امام احمد ابن حنبل کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم ان تمام چیزوں میں جاری ہوگا۔ جو کھانے کے کام میں آتی ہیں۔ اگرچہ وہ مکیل اور موزون نہ ہوں۔ یہ امام شافعی کی رائے ہے اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کی بھی۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم طعام کے ساتھ مخصوص ہے بشرطیکہ وہ پیمانہ اور وزن کے لحاظ سے لیا اور دیا جائے۔ یہ سعید بن المسیب کا مذہب ہے اور ایک ایک روایت اس باب میں امام شافعی اور امام احمد سے بھی منقول ہے۔

پانچواں گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے ان چیزوں کے ساتھ جو قُوت کے کام آتی ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

درہم و دینار کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ ان میں علت تحریم موزونیت ہے۔ اور شافعی و مالک اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کی رائے یہ ہے کہ

شنیت اس کی علت ہے۔

مذاہب کے اس اختلاف سے جزئی معاملات میں حکم تحریم کا اجراء بھی مختلف ہو گیا ہے۔ ایک چیز ایک مذہب میں سرے سے جنس ربوی ہی نہیں ہے اور دوسرے مذہب میں اس کا شمار اجناس ربویہ میں ہوتا ہے۔ ایک مذہب کے نزدیک ایک شے میں علت تحریم کچھ اور ہے اور دوسرے مذہب کے نزدیک کچھ اور۔ اس لئے بعض معاملات ایک مذہب کے لحاظ سے سود کی زد میں آجاتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لحاظ سے نہیں آتے۔ لیکن یہ تمام اختلافات اُن امور میں نہیں ہیں جو کتاب وسنت کے صریح احکام کی رو سے "ربوٰ" کے حکم میں داخل ہیں۔ بلکہ ان کا تعلق صرف مشتبہات سے ہے، اور ایسے امور سے ہے جو حلال وحرام کی درمیانی سرحد پر واقع ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اختلافی مسائل کو حجت بنا کر اُن معاملات میں شریعت کے احکام کو مشتبہ ٹھیرانے کی کوشش کرے جن کے سود ہونے پر نصوص صریحہ وارد ہو چکی ہیں، اور اس طریق احتجاج سے رخصتوں اور حیلوں کا دروازہ کھولے، اور پھر اُن دروازوں سے بھی گذر کر امت کو سرمایہ داری کے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے۔ وہ خواہ اپنی جگہ نیک نیت اور خیر خواہ ہی کیوں نہ ہو حقیقت میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنہوں نے کتاب وسنت کو چھوڑ کر ظن وتخمین کی پیروی کی، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

معاشی قوانین کی تدوین جدید | ہم تسلیم کرتے ہیں کہ زمانے کے حالات بدل چکے ہیں، دنیا کے تمدنی اور معاشی احوال میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا ہے، اور اس انقلاب نے مالی اور تجارتی معاملات کی صورت کچھ سے کچھ کر دی ہے۔ ایسے حالات میں وہ اجتہادی قوانین جو اسلام کے ابتدائی دور میں حجاز، عراق، شام اور مصر کے معاشی وتمدنی حالات کو ملحوظ رکھ کر مدون کیے گئے تھے مسلمانوں کی موجودہ ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہیں۔ فقہائے کرام نے اس دور میں احکام شریعت کی جو تعبیر کی تھی

وہ معاملات کی ان صورتوں کے لیے تھی جو ان کے گرد و پیش کی دنیا میں پائی جاتی تھیں، مگر اب ان میں سے اکثر صورتیں باقی نہیں رہی ہیں، اور بہت سی دوسری صورتیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جو اس وقت موجود نہ تھیں، اس لیے بیع و شرا اور مالیات و معاشیات کے متعلق جو قوانین ہماری فقہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی اب حاجت نہیں رہی اور جن قوانین کی اب حاجت ہے وہ ان میں موجود نہیں ہیں۔ پس اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ معاشی اور مالی معاملات کے لئے قانون اسلامی کی تدوین جدید ہونی چاہیے یا نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ تدوین کس طرز پر ہو؟

تجدید سے پہلے تفکر کی ضرورت ہمارے تجدد پسند حضرات نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اگر اس کا اتباع کیا جائے اور ان کی اہواء کے مطابق احکام کی تدوین کی جائے تو یہ تدوین در اصل اسلامی شریعت کے احکام کی تدوین نہ ہوگی بلکہ ان کی تخریب ہوگی، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم درحقیقت اپنی معاشی زندگی میں اسلام سے مرتد ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ طریقہ جس کی طرف یہ حضرات ہماری رہنمائی کر رہے ہیں اپنے مقاصد اور نظریات اور اصول و مبادی میں اسلامی طریقہ سے کلی منافات رکھتا ہے۔ ان کا مقصود محض کسب مال ہے اور اسلام کا مقصود اکل حلال۔ ان کا منتہائے آمال یہ ہے کہ انسان لکھ پتی اور کروڑ پتی بنے، عام اس سے کہ جائز ذرائع سے بنے یا ناجائز ذرائع سے۔ مگر اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان جو کچھ کمائے جائز طریقہ سے، دوسروں کی حق تلفی کیے بغیر کمائے، خواہ لکھ پتی بن سکے یا نہ بن سکے۔ وہ کامیاب اس کو سمجھتے ہیں جس نے دولت حاصل کی، زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل پر قابو پایا، اور ان کے ذریعہ سے آسایش، عزت، طاقت اور نفوذ و اثر کا مالک ہوا، خواہ یہ کامیابی اس نے کتنی ہی خود غرضی، ظلم، شقاوت، جھوٹ، فریب اور بے حیائی سے حاصل کی ہو، اور اس کے لئے اپنے دوسرے ابنائے نوع کے حقوق پر کتنے ہی ڈاکے ڈالے ہوں اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے دنیا میں شر و فساد، بداخلاقی اور فواحش پھیلانے

اور نوعِ انسانی کو مادی اخلاقی اور روحانی ہلاکت کی طرف دھکیلنے میں ذرہ برابر دریغ نہ کیا ہو لیکن اسلام کی نگاہ میں کامیاب وہ ہے جس نے صداقت، امانت، نیک نیتی، اور دوسروں کے حقوق ومفاد کی پوری نگہداشت کے ساتھ کسب معاش کی جد وجہد کی۔ اگر اس طرح کی جد وجہد میں وہ کروڑپتی بن گیا تو یہ اللہ کا انعام ہے لیکن اگر اس کو تمام عمر صرف قوتِ لایموت ہی پر زندگی بسر کرنی پڑی ہو اور اس کو پہننے کے لیے پیوند لگے کپڑوں اور رہنے کے لیے ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی سے زیادہ کچھ نصیب نہ ہوا ہو تب بھی وہ ناکام نہیں نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اُن کو اسلام کے بالکل مخالف ایک دوسرے راستہ کی طرف لے جاتا ہے جو خالص سرمایہ داری کا راستہ ہے اس راستے پر چلنے کے لیے ان کو جن قوانین اور جن آسانیوں اور رخصتوں اور اباحتوں کی ضرورت ہے وہ اسلام میں کسی طرح نہیں مل سکتے۔ اسلام کے اصول اور احکام کو کھینچ تان کر خواہ کتنا ہی پھیلا دیجئے، مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ اصول اور احکام وضع ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کی تحصیل کے لیے ان سے کوئی ضابطہ اور دستور العمل اخذ کیا جا سکے پس جو شخص اس راستہ پر جانا چاہتا ہو، اس کے لیے تو بہتر یہی ہے کہ وہ دنیا کو اور خود اپنے نفس کو دھوکہ دینا چھوڑ دے، اور اچھی طرح سمجھ لے کہ سرمایہ داری کے راستہ پر چلنے کے لیے اس کو اسلام کے بجائے صرف یورپ اور امریکہ ہی کے معاشی اور مالی اصول و احکام کا اتباع کرنا پڑیگا رہے وہ لوگ جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ قرآن اور طریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں اسی کا اتباع کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کو ایک جدید ضابطۂ احکام کی ضرورت دراصل اس لیے نہیں ہے کہ وہ نظام سرمایہ داری کے ادارات سے فائدہ اٹھا سکیں یا ان کے لیے قانون اسلامی میں ایسی سہولتیں پیدا کی جائیں جن سے وہ کروڑپتی تاجر، ساہوکار اور کارخانہ دار بن سکیں، بلکہ ان کو

ایسے ایک ضابطہ کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ جدید زمانے کے معاشی حالات اور مالی و تجارتی معاملات میں اپنے طرز عمل کو اسلام کے صحیح اصولوں پر ڈھال سکیں، اور اپنے لین دین میں ان طریقوں سے بچ سکیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہیں۔ اور جہاں دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کرنے میں ان کو حقیقی مجبوریاں پیش آئیں وہاں ان رخصتوں سے فائدہ اٹھا سکیں جو اسلامی شریعت کے دائرے میں ایسے حالات کے لیے نکل سکتی ہیں۔ اس غرض کے لیے قانون کی تدوین جدید بلاشبہ ضروری ہے اور علماء اسلام کا فرض ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی سعی بلیغ کریں۔

اسلامی قانون میں تجدید کی ضرورت اسلامی قانون کوئی ساکن اور منجمد (Static) قانون نہیں ہے کہ ایک خاص زمانہ اور خاص حالات کے لیے اس کو جس صورت پر مدوّن کیا گیا ہو اسی صورت پر وہ ہمیشہ قائم رہے اور ازمنہ و احوال کے بدل جانے پر بھی اس صورت میں کوئی تغیر نہ کیا جاسکے۔ یہ نظریہ جن حضرات کا ہے وہ غلطی پر ہیں، بلکہ ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی قانون کی روح ہی کو نہیں سمجھے ہیں۔ اسلام میں دراصل شریعت کی بنیاد حکمت اور عدل پر رکھی گئی ہے۔ تشریع کا اصل مقصد بندگان خدا کے معاملات اور تعلقات کی تنظیم اس طور پر کرنا ہے کہ ان کے درمیان مزاحمت کے بجائے معاونت ہو، ایک دوسرے کے مقابلہ میں ان کے حقوق اور فرائض کامل عدل اور توازن کے ساتھ متعین ہو جائیں، اور نظام اجتماعی میں ہر شخص نہ صرف اپنے کمال لائق کو پہنچ سکے، بلکہ دوسروں کے لیے بھی ان کے کمالات لائقہ کو پہنچنے میں مددگار ہو، یا کم از کم مانع و مزاحم بن کر موجب فساد نہ ہو جائے۔ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی اور حقائق اشیاء کے اس علم کی بناء پر جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے زندگی کے ہر شعبہ میں چند ہدایات

دی ہیں، اور اس کے رسول نے اسی کے دئے ہوئے علم سے ان ہدایات کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ہمارے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ ہدایات اگرچہ ایک خاص زمانے اور خاص حالات میں دی گئی تھیں اور ان کو ایک خاص سوسائٹی کے اندر نافذ کرایا گیا تھا، لیکن ان کے الفاظ اور طریق نفاذ سے قانون کے چند ایسے وسیع اور ہمہ گیر اصولوں کی تعلیم دے دی گئی ہے جو ہر زمانے ہر احوال اور ہر حالت میں تشریع کے اسی مقصد کو پورا کر سکتے ہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلام میں جو چیز ثابت اور غیر متبدل ہے وہ یہی اصول ہیں۔ اب یہ متفقہین کا کام ہے کہ عملی زندگی میں جیسے جیسے حالات اور حوادث پیش آتے جائیں ان کے لیے اصول شریعت کے مطابق صحیح قوانین بناتے جائیں، اور معاملات میں ان کو اس طور پر نافذ کریں کہ شارع کا اصل مقصد پورا ہو۔ شریعت کے اصول جس طرح ثابت اور غیر متبدل ہیں اس طرح وہ قوانین ثابت اور غیر متبدل نہیں ہیں جن کو انسانوں نے ان اصولوں پر متفرع کیا ہے، کیونکہ وہ اصول خدا نے بنائے ہیں اور یہ قوانین انسانوں نے وضع کیے ہیں، وہ تمام ازمنہ و امکنہ اور احوال و حوادث کے لیے ہیں، اور یہ خاص حالات اور خاص حوادث کے لیے۔

تجدید کے لیے چند ضروری شرطیں پس اسلام میں اس امر کی پوری وسعت رکھی گئی ہے کہ تغیر احوال اور خصوصیات حوادث کے لحاظ سے احکام میں اصول شرع کے تحت تغیر کیا جا سکے، اور جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی جائیں ان کو پورا کرنے کے لیے قوانین وضع کیے جا سکیں۔ اس معاملے میں ہر زمانے اور ہر جماعت کے متفقہین کو قانون سازی کے پورے اختیارات حاصل ہیں، اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کسی خاص دور کے اہل علم کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لیے وضع قانون کا چارٹر دے کر دوسروں کے اختیارات کو سلب کر لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو اپنے منشا اور اپنی اہواء کے مطابق احکام کو بدل ڈالنے اور اصول کو توڑ مروڑ کر

ان کی الٹی سیدھی تاویلیں کرنے، اور قوانین کو شارع کے اصل مقصد سے پھیر دینے کی آزادی حاصل ہو۔ اس کے لئے بھی ایک ضابطہ ہے اور وہ چند شرائط پر مشتمل ہے۔

پہلی شرط | قانون سازی کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مزاج شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے[1]۔ ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہوگی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائیگا۔ اور ہر موقع پر اس کی بصیرت اس کو بتادے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے، اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل کیا جائے گا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہوگا، بلکہ اپنے محل خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اتنا ہی بجا ہوگا جتنا خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر کا یہ حکم کہ دوران جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے، اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابومحجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا، اور حضرت عمر کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانہ میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شارع کے صریح احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص شریعت کا مزاج دان ہے وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکم عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصود شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ

---

[1] یہاں اشارۃً یہ کہدینا بیجا نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ہماری دینی تعلیم سے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ خارج ہو گیا ہے اور اس کی جگہ محض فقہ کے کسی ایک سسٹم کی تعلیم نے لے لی ہے اور یہ تعلیم بھی اس طرح دیجاتی ہے کہ ابتدا ہی سے خدا و رسول کے منصوص احکام اور ائمہ کے اجتہادات کے درمیان حقیقی فرق و امتیاز طالب علم کے پیش نظر نہیں رہتا۔ کوئی شخص جب تک حکیمانہ طریق پر قرآن میں بصیرت حاصل نہ کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا بغور مطالعہ نہ کرے، اسلام کے مزاج اور اسلامی قانون کے اصول کو نہیں سمجھ سکتا۔ اجتہاد کے لیے یہ چیز ضروری ہے اور تمام عمر فقہ کی کتابیں پڑھتے رہنے سے بھی یہ حاصل نہیں ہوسکتی۔

جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمر نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیدیا، پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھالے تو اس کے لیے جائز ہو جائے۔ یہ کہکر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقات ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمر نے جو حکم صادر فرمایا وہ بھی عہد رسالت کے عملدرآمد سے مختلف تھا مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کیے گئے تھے اس لیے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ بہ خلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کر دیتا ہے اور مفضی الی الفساد ہو جاتا ہے۔

دوسری شرط: مزاج شریعت کو سمجھنے کے بعد دوسری اہم شرط یہ ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں قانون سازی کی ضرورت ہو اس کے متعلق شارع کے جملہ احکام پر نظر ڈالی جائے اور ان میں غور و فکر کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ ان سے شارع کا مقصد کیا ہے، وہ کس نقشہ پر اس شعبہ کی تنظیم کرنا چاہتا ہے، اسلامی زندگی کے وسیع تر نقشہ میں اس شعبۂ خاص کا کیا مقام ہے، اور اس مقام کی مناسبت سے اس شعبہ میں شارع نے کیا پالیسی اختیار کی ہے۔ اس چیز کو سمجھے بغیر جو قانون وضع کیا جائیگا یا پچھلے قانون میں جو حذف و اضافہ کیا جائے گا، وہ مقصود شارع کے مطابق نہ ہوگا اور اس سے قانون کا رخ اپنے مرکز سے منحرف ہو جائے گا۔ قانون اسلامی میں ظواہر احکام کی اہمیت اتنی نہیں ہے جتنی مقاصد احکام کی ہے۔ فقیہ کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ شارع کے مقصود اور اس کی حکمت و مصلحت پر نظر رکھے۔ بعض خاص مواقع ایسے آتے ہیں جن میں اگر

ظواہر احکام پر (جو عام حالات کو مد نظر رکھ کر دیے گئے تھے) عمل کیا جائے تو اصل مقصد فوت ہو جائے۔ ایسے وقت میں ظاہر کو چھوڑ کر اس طریق پر عمل کرنا ضروری ہے جس سے شارع کا مقصد پورا ہوتا ہو۔ قرآن مجید میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی جیسی کچھ تاکید کی گئی ہے، معلوم ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے، مگر اس کے باوجود آپ نے ظالم و جابر اُمراء کے مقابلہ میں خروج سے منع فرما دیا کیونکہ شارع کا اصل مقصد تو فساد کو صلاح سے بدلنا ہے جب کسی فعل سے اور زیادہ فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور صلاح کی امید نہ ہو تو اس سے احتراز بہتر ہے علامہ ابن تیمیہ کے حالات میں ہے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں ایک گروہ پر ان کا گذر ہوا جو شراب و کباب میں مشغول تھا، علامہ کے ساتھیوں نے ان لوگوں کو شراب سے منع کرنا چاہا مگر علامہ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ اللہ نے شراب کو سدِ باب فتنہ کے لئے حرام کیا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ شراب ان ظالموں کو ایک بڑے فتنے یعنی قتل نفوس اور نہب اموال سے روکے ہوئے ہے لہٰذا ایسی حالت میں ان کو شراب سے روکنا مقصود شارع کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوا کہ حوادث کی خصوصیات کے لحاظ سے احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر تغیر ایسا ہونا چاہیے جس سے شارع کا اصل مقصد پورا ہو نہ کہ الٹا فوت ہو جائے۔

اسی طرح بعض احکام ایسے ہیں جو خاص حالات کی رعایت سے خاص الفاظ میں دیے گئے تھے۔ اب فقیہ کا کام یہ نہیں ہے کہ تغیر احوال کے باوجود انہی الفاظ کی پابندی کرے بلکہ اس کو ان الفاظ سے شارع کے اصل مقصد کو سمجھنا چاہیے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے حالات کے لحاظ سے مناسب احکام وضع کرنے چاہییں۔ مثلاً حضور نے صدقۂ فطر میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو یا ایک صاع کشمش دینے کا حکم فرمایا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس وقت مدینہ میں جو صاع رائج تھا اور یہ اجناس جن کا حضور نے ذکر فرمایا بعینہا منصوص ہیں۔ شارع کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عید کے روز ہر مستطیع شخص اتنا صدقہ دے کہ اس کا ایک غیر مستطیع بھائی اس صدقہ میں اپنے بال بچوں

کے ساتھ کم از کم عید کا زمانہ خوشی کے ساتھ گذار سکے، اس مقصد کو کسی دوسری صورت سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے جو شارع کی تجویز کردہ صورت سے اقرب ہو۔

تیسری شرط پھر یہ بھی ضروری ہے کہ شارع کے اصول تشریع اور طرز قانون سازی کو خوب سمجھ لیا جائے تاکہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام وضع کرنے میں انہی اصولوں کی پیروی اور اسی طرز کی تقلید کی جا سکے۔ یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان مجموعی طور پر شریعت کی ساخت اور پھر فرداً فرداً اس کے احکام کی خصوصیات پر غور نہ کرلے۔ شارع نے کس طرح احکام میں عدل اور توازن قائم کیا ہے۔ کس کس طرح اس نے انسانی فطرت کی رعایت کی ہے دفع مفاسد اور جلب مصالح کے لیے اس نے کیا طریقے اختیار کئے ہیں کس ڈھنگ پر وہ انسانی معاملات کی تنظیم اور اس میں انضباط پیدا کرتا ہے کس طریقہ سے وہ انسان کو اپنے بلند مقاصد کی طرف لیجاتا ہے اور پھر ساتھ ساتھ اس کی فطری کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اس کے راستہ میں مناسب سہولتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ سب امور تفکر و تدبر کے محتاج ہیں اور ان کے لیے نصوص قرآنی کی لفظی و معنوی دلالتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی حکمتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اس علم اور تفقہ سے بہرہ ور ہو وہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام میں جزوی تغیر و تبدل بھی کر سکتا ہے اور جن معاملات کے حق میں نصوص موجود نہیں ان کے لیے نئے قوانین بھی وضع کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص قانون سازی میں جو طریقہ اختیار کرے گا وہ اسلام کے اصول تشریع سے منحرف نہ ہوگا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے مگر اجتہاد سے کام لے کر اس حکم کو عجم کے مجوسیوں، ہندوستان کے بت پرستوں اور افریقہ کے بربری باشندوں پر بھی وسیع کر دیا گیا۔ اسی طرح خلفاء راشدین کے عہد میں جب ممالک فتح ہوئے تو غیر قوموں کے ساتھ بکثرت ایسے معاملات پیش آئے جن کے متعلق کتاب و سنت میں صریح احکام موجود نہ تھے صحابہ کرام نے ان کے لئے خود ہی قوانین مدون کئے اور وہ اسلامی شریعت کی

اسپرٹ اور اس کے اصول سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔

چوتھی شرط | احوال اور حوادث کے جو تغیرات، احکام میں تغیر، یا جدید قانون سازی کے مقتضی ہوں ان کو دو حیثیتوں سے جانچنا ضروری ہے۔ ایک یہ حیثیت کہ وہ حالات بجائے خود کس قسم کے ہیں! ان کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کے اندر کونسی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ دوسری یہ حیثیت کہ اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے ان میں کس کس نوع کے تغیرات ہوئے ہیں اور ہر نوع کا تغیر احکام میں کس طرح کا تغیر چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر اُسی مسئلہ کو لیجئے جو اس وقت زیر بحث ہے۔ معاشی قوانین کی تدوین جدید کے لیے ہم کو سب سے پہلے زمانہ حال کی معاشی دنیا کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم گہری نظر سے معاشیات، مالیات اور لین دین کے جدید طریقوں کا مطالعہ کریں گے، معاشی زندگی کے باطن میں جو قوتیں کام کر رہی ہیں ان کو سمجھیں گے۔ ان کے نظریات اور اصول سے واقفیت حاصل کریں گے۔ اور ان اصول و نظریات کا ظہور جن عملی صورتوں میں ہو رہا ہے ان پر اطلاع حاصل کریں گے۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ زمانۂ سابق کی بہ نسبت ان معاملات میں جو تغیرات ہوئے ہیں ان کو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے کن اقسام منقسم کیا جا سکتا ہے، اور ہر قسم پر شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد اور اصول تشریع کی مناسبت سے کس طرح کے احکام جاری ہونے چاہیں۔ جزئیات سے قطع نظر کر کے، اصولاً ان تغیرات کو ہم دو قسموں پر منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ تغیرات جو درحقیقت تمدنی احوال کے بدل جانے سے رونما ہوئے ہیں اور جو دراصل انسان کے علمی و عقلی نشو و ارتقا اور خزائن الٰہی کے مزید اکتشافات اور مادی اسباب و وسائل کی ترقی اور حمل و نقل اور مخابرات کی سہولتوں، اور بین الاقوامی تعلقات کی وسعتوں کے طبعی نتائج ہیں۔ ایسے تغیرات اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طبعی اور حقیقی تغیرات ہیں۔ جن کو نہ تو مٹایا جا سکتا ہے اور نہ مٹانا

مطلوب ہے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے اثر سے معاشی احوال اور مالی معاملات اور تجارتی لین دین کی جو نئی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، ان کے لیے اصول شریعت کے تحت نئے احکام وضع کیے جائیں تاکہ ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اپنے عمل کو ٹھیک ٹھیک اسلامی طرز پر ڈھال سکیں۔

۲- وہ تغیرات جو دراصل تمدنی ترقی کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ دنیا کے معاشی نظام اور مالی معاملات پر سرمایہ داروں کے حاوی ہوجانے کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ وہی سرمایہ داری جو عہد جاہلیت میں پائی جاتی تھی، اور جس کو اسلام نے صدیوں تک مغلوب کر رکھا تھا، اب دوبارہ معاشی دنیا پر غالب آگئی ہے، اور تمدن کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے کام لے کر اس نے اپنے انہی پرانے نظریات کو نت نئی صورتوں سے معاشی زندگی کے مختلف معاملات میں پھیلا دیا ہے۔ سرمایہ داری کے اس غلبہ سے جو تغیرات واقع ہوئے ہیں وہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حقیقی اور طبیعی تغیرات نہیں ہیں، بلکہ جعلی تغیرات ہیں جنہیں قوت سے مٹایا جاسکتا ہے، اور جن کا مٹا دیا جانا نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ مسلمان کا اصلی فرض یہ ہے کہ اپنی پوری قوت ان کے مٹانے میں صرف کردے اور معاشی نظام کو اسلامی اصول پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔

سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنے کا فرض کمیونسٹ سے بڑھ کر مسلمان پر عائد ہوتا ہے کیونکہ کمیونسٹ کے سامنے محض روٹی کا سوال ہے، اور مسلمان کے سامنے دین و اخلاق کا سوال۔ کمیونسٹ محض [illegible] (Proletariates) کی خاطر جنگ کرنا چاہتا ہے اور مسلمان تمام نوع بشری کے حقیقی فائدے کے لیے جنگ کرتا ہے جس میں خود سرمایہ دار بھی شامل ہیں۔ کمیونسٹ کی جنگ خودغرضی پر مبنی ہے اور مسلمان کی جنگ للّٰہیت پر۔ لہٰذا مسلمان تو سرمایہ داری نظام سے کبھی مصالحت کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ مسلم ہے اور اسلام کا پابند ہے تو اس کے خدا کی طرف سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس ظالمانہ نظام کو مٹانے کی کوشش کرے، اور اس جنگ میں جو ممکن نقصان اس کو پہنچ سکتا ہو اسے مردانہ

برداشت کرے۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں اسلام جو قانون بھی بنائے گا اس کی غرض یہ ہرگز نہ ہوگی کہ مسلمانوں کے لیے سرمایہ داری نظام میں ضم ہونے اور اس کے ادارات میں حصہ لینے اور اس کی کامیابی کے اسباب فراہم کرنے میں سہولتیں پیدا کی جائیں، بلکہ اس کی واحد غرض یہ ہوگی کہ مسلمانوں کو اس گندگی سے محفوظ رکھا جائے، اور تمام ان دروازوں کو بند کیا جائے جو مسلمان کو سرمایہ داری کی طرف لے جاتے ہیں۔

تخفیفات کے عام اصول | اس موقع پر یہ کہا جائیگا کہ جب مفاسد زیادہ پھیل گئے ہوں اور اسلام کے مخالف کوئی نظام مسلمانوں پر غالب آگیا ہو، اور مسلمانوں کے لیے مغلوبیت کی وجہ سے مشکلات پیش آرہی ہوں تو اسلام میں ایسے حالات کے لیے رخصتوں اور سہولتوں کی بھی تو کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ قول ایک حد تک بجا ہے۔ بلاشبہ اسلامی قانون کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات اور المشقۃ تجلب التیسیر۔ چنانچہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں متعدد مواقع پر شریعت کے اس قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲: ۲۸۶)　　اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ (۲: ۲۳)۔　　اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ۲۲/۱۰　　اس نے تم پر دین میں سختی نہیں کی ہے۔

وفی الحدیث: احب الدین الی اللہ تعالیٰ الحنفیۃ السمحۃ　　اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا سادا اور نرم ہو۔

ولا ضرر ولا ضرار فی الاسلام　　اسلام میں ضرر اور ضرار نہیں ہے۔

پس یہ قاعدہ اسلام میں مسلم ہے کہ جہاں مشقت اور ضرر ہو وہاں احکام میں نرمی کردی

جائے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر خیالی اور وہمی ضرورت پر تکالیف شرعیہ اور حدود الٰہیہ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ اس کے لیے بھی چند اصول اور ضوابط ہیں جو شریعت کی تخفیفات پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں:-

اولاً یہ دیکھنا چاہیے کہ مشقت کس درجہ کی ہے۔ مطلقاً ہر مشقت پر تو تکلیف شرعی رفع نہیں کی جاسکتی، ورنہ سرے سے کوئی قانون ہی باقی نہ رہے گا۔ جاڑے میں وضو کی تکلیف، گرمی میں روزے کی تکلیف، سفر حج اور جہاد کی تکالیف یقیناً مشقت کی تعریف میں آتی ہیں، مگر یہ ایسی مشقتیں نہیں ہیں جن کی وجہ سے تکلیفات ہی کو سرے سے ساقط کر دیا جائے۔ تخفیف یا اسقاط کے لیے مشقت ایسی ہونی چاہیے جو موجب ضرر ہو، مثلاً سفر کی مشکلات، مرض کی حالت، کسی ظالم کا جبر و اکراہ، تنگ دستی، کوئی غیر معمولی مصیبت، فتنۂ عام، یا کوئی جسمانی نقص۔ ایسے مخصوص حالات میں شریعت نے بہت سے احکام میں تخفیفات کی ہیں اور ان پر دوسری تخفیفات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے

ثانیاً تخفیف اسی درجہ کی ہونی چاہیے جس درجہ کی مشقت اور مجبوری ہے۔ مثلاً جو شخص بیماری میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اس کے لیے لیٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔ جس بیماری کے لیے رمضان میں دس روزوں کا قضا کرنا کافی ہے اس کے لیے پورے رمضان کا افطار ناجائز ہے۔ جس شخص کی جان شراب کا ایک چلو پی کر یا حرام چیز کے ایک دو لقمے کھا کر بچ سکتی ہے، وہ اس حقیقی ضرورت سے بڑھ کر پینے یا کھانے کا مجاز نہیں ہے۔ اسی طرح طبیب کے لیے جسم کے پوشیدہ حصوں میں جتنا دیکھنے کی واقعی ضرورت ہے اس سے زیادہ دیکھنے کا اس کو حق نہیں۔ اس قاعدہ کے لحاظ سے تمام تخفیفات کی مقدار، مشقت اور ضرورت کی مقدار پر مقرر کی جائے گی۔

ثالثاً کسی ضرر کو دفع کرنے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار نہیں کی جاسکتی جس میں اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضرر ہو۔ بلکہ صرف ایسی تدبیر کی اجازت دی جاسکتی ہے جس کا ضرر نسبتہً خفیف ہو

اسی کے قریب قریب قاعدہ بھی ہے کہ کسی مفسدہ سے بچنے کے لیے اس سے بڑے یا اس کے برابر کے مفسدہ میں مبتلا ہو جانا جائز نہیں ہے۔ البتہ یہ جائز ہے کہ جب انسان دو مفسدوں میں گھر جائے تو بڑے مفسدہ کو دفع کرنے کے لیے چھوٹے مفسدہ کو اختیار کرلے۔

رابعاً طلب مصالح پر دفع مفاسد مقدم ہے۔ شریعت کی نگاہ میں بھلائیوں کے حصول اور ماموراتو واجبات کے ادا کرنے کی بہ نسبت برائیوں کو دور کرنا، اور حرام سے بچنا، اور فساد کو دفع کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے اسی لیے وہ مشقت کے مواقع پر مامورات میں جس فیاضی کے ساتھ تخفیف کرتی ہے، اتنی فیاضی منہیات اور محرمات کی اجازت دینے میں نہیں برتتی۔ سفر اور مرض کی حالتوں میں، نماز روزے اور دوسرے واجبات کے معاملہ میں جتنی تخفیفیں کی گئی ہیں اتنی تخفیفیں نجاستوں اور حرام چیزوں کے استعمال میں نہیں کی گئیں۔

خامساً مشقت یا ضرر کے زائل ہوتے ہی تخفیف بھی ساقط ہو جاتی ہے، مثلاً بیماری رفع ہو جانے کے بعد تیمم کی اجازت باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ سود میں شریعت کی تخفیفات مذکورۂ بالا قواعد کو ذہن نشین کر لینے کے بعد غور کیجئے کہ سود کے مسئلہ میں احکام شریعت کے اندر کس حد تک تخفیف کی جا سکتی ہے۔

(۱) سود لینے اور سود دینے کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ سود پر قرض لینے کے لیے تو انسان بعض حالات میں مجبور ہو سکتا ہے لیکن سود کھانے کے لیے درحقیقت کوئی مجبوری پیش نہیں آسکتی۔ سود تو وہی لے گا جو مالدار ہو، اور مالدار کو ایسی کیا مجبوری پیش آسکتی ہے جس میں اس کے لیے حرام حلال ہو جائے؟

(۲) سودی قرض لینے کے لیے بھی ہر ضرورت، مجبوری کی تعریف میں نہیں آتی۔ شادی بیاہ اور خوشی و غمی کی رسموں میں فضول خرچی کرنا کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ موٹر خریدنا یا مکان

لینا ناکوئی واقعی مجبوری نہیں ہے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا، یا کار و بار کو ترقی دینے کے لیے روپیہ فراہم کرنا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے امور جن کو "ضرورت" اور "مجبوری" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جن کے لیے مہاجنوں سے ہزاروں روپے قرض لیے جاتے ہیں، شریعت کی نگاہ میں ان کی قطعاً کوئی وقعت نہیں اور ان اغراض کیلئے جو لوگ سود دیتے ہیں وہ سخت گناہ گار ہیں۔ شریعت اگر کسی مجبوری پر سودی قرض لینے کی اجازت دے سکتی ہے تو وہ اس قسم کی مجبوری ہے، جس میں حرام حلال ہو سکتا ہو۔ یعنی کوئی سخت مصیبت جس میں سود پر قرض لیے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، جان یا عزت پر آفت آگئی ہو یا کسی ناقابل برداشت مشقت یا ضرر کا حقیقی اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں ایک مجبور مسلمان کے لیے سودی قرض لینا جائز ہوگا۔ مگر وہ تمام ذی استطاعت مسلمان گنہگار رہوں گے جنہوں نے اس مصیبت میں اپنے اس بھائی کی مدد نہ کی اور اس کو فعل حرام کے ارتکاب پر مجبور کر دیا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس گناہ کا وبال پوری قوم پر ہوگا، کیونکہ اس نے زکوٰۃ و خیرات اور اوقاف کی تنظیم سے غفلت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے افراد بے سہارا ہو گئے اور ان کے لیے اپنی ضرورتوں کے وقت ساہوکاروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔

(۳) شدید مجبوری کی حالت میں بھی صرف بقدرِ ضرورت قرض لیا جا سکتا ہے اور لازم ہے کہ استطاعت بہم پہنچتے ہی سب سے پہلے اس سے سبکدوشی حاصل کی جائے کیونکہ ضرورت رفع ہو جانے کے بعد سود کا ایک پیسہ دینا بھی حرام مطلق ہے۔ یہ سوال کہ آیا ضرورت شدید ہے کہ نہیں، اور اگر شدید ہے تو کس قدر رہی ہے، اور کس وقت وہ رفع ہو گئی، اس کا تعلق اس شخص کی عقل اور احساس دینداری سے ہے جو اس حالت میں مبتلا ہوا ہو۔ وہ جتنا زیادہ دیندار اور خدا ترس ہوگا، اور اس کا ایمان جتنا زیادہ قوی ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ وہ اس باب میں محتاط ہوگا۔

(۴) جو لوگ اپنے مال کی حفاظت یا موجودہ انتشار قومی کی وجہ سے اپنے مستقبل کی طمانیت کے لیے بنکوں میں روپیہ جمع کرائیں، یا انشورنس کمپنی میں بیمہ کرائیں، یا جن کو کسی قاعدہ کے تحت پراویڈنٹ فنڈ میں حصہ لینا پڑے ان کے لیے لازم ہے کہ اقتضائے مدت کے بعد صرف اپنا راس المال واپس لیں۔ اور اس راس المال میں سے بھی ڈھائی فیصدی سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کریں، کیونکہ اس کے بغیر وہ جمع شدہ رقم ان کے لیے ایک نجاست ہوگی، بشرطیکہ وہ خدا پرست ہوں زر پرست نہ ہوں۔

(۵) بنک یا انشورنس کمپنی یا پراویڈنٹ فنڈ سے سود کی جو رقم ان کے حساب میں نکلتی ہو اس کو سرمایہ داروں کے پاس چھوڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن مفسدوں کے لیے مزید تقویت کا موجب ہوگا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس رقم کو ان سے لے کر ان مفلس مسلمانوں پر خرچ کر دیا جائے جن کی حالت قریب قریب وہی ہے جس میں حرام کھانا انسان کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔

(۶) مالی لین دین اور تجارتی کاروبار میں جتنے منافع، سود کی تعریف میں آتے ہوں، یا جن میں سود کا اشتباہ ہو، ان سب سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے اور احتراز ممکن نہ ہو تو وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو نمبر ۵ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں ایک ایماندار مسلمان کی نظر جلب منفعت پر نہیں بلکہ دفع مفاسد پر ہونی چاہیے۔ اگر وہ خدا سے ڈرتا ہے اور یوم آخر پر اعتقاد رکھتا ہے تو حرام سے بچنا اور خدا کی پکڑ سے محفوظ رہنا اس کے لیے کاروبار کی ترقی اور مالی فوائد کے حصول سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔

اب اس سلسلہ مضمون میں سود کی بحث کو ختم کیا جاتا ہے کیونکہ آئندہ اشاعت میں اسی سلسلہ کے دوسرے مسئلہ یعنی مسئلہ حجاب پر کلام کرنا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سود کے مسئلہ پر مباحثہ کا دروازہ بند کیا جا رہا ہے گذشتہ پچاس سال سے اس باب میں اس کثرت کے ساتھ غلط خیالات کی اشاعت ہو رہی ہے کہ کسی ایک مضمون سے ان سب کی اصلاح نہیں ہو سکتی جن حضرات کی اس مضمون سے تشفی نہ ہوئی ہو، وہ اپنے شبہات و اعتراضات پیش کر سکتے ہیں انشاء اللہ ان کی تفہیم کے لیے پوری کوشش کی جائے گی وما توفیقی الا باللہ۔

مطبوعات

الاصلاح ماہوار رسالہ زیر ادارت مولنا امین احسن صاحب اصلاحی ۔ دائرہ حمیدیہ ۔ سرائے میر (ضلع اعظم گڈھ) ضخامت ۴۰ صفحات قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ ۔

علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ نے دائرہ حمیدیہ کے نام سے ایک علمی حلقہ قائم کیا ہے جس کا مقصد اول علامہ مرحوم کی عربی تصنیفات اور ان کے اردو ترجموں کی اشاعت ہے۔ مقصد دوم یہ ہے کہ مرحوم کے طریق پر قرآن مجید میں تدبر کیا جائے اور تحقیق کے نتائج کو مستقل تصنیفات یا مضامین کی صورت میں شائع کیا جائے۔ زیر نظر رسالہ اسی دائرہ کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔ علامہ مرحوم کی تفسیر سورۂ فیل کا اردو ترجمہ اس میں مسلسل شایع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب و نظم قرآن، ترجمۂ قرآن کے اصول، اور دوسرے مسائل پر ان کے خیالات جو اب تک صرف مسودوں کی صورت میں تھے، اس رسالہ کے ذریعہ سے پہلی مرتبہ برسرعام آئے ہیں۔ مرحوم کے فاضل تلامذہ میں سے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولوی ابواللیث تیسیر محمد صاحب ندوی اور بعض دوسرے اہل قلم حضرات کے مفید مضامین بھی مطالعہ کے قابل ہیں۔

قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے معانی کی تحقیق ایک نہایت وسیع مضمون ہے جس کے بے شمار گوشے اور بہت سے مختلف پہلو ہیں۔ کوئی شخص ان سب کا احاطہ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ایسی تفسیر کر سکتا ہے جس پر من کل الوجوہ تمام اہل نظر کو اتفاق ہو۔ مفسرین کی آراء اور ان کے طرز تفسیر و تحقیق میں اختلاف ہمیشہ پایا گیا ہے اور پایا جائیگا۔ مگر جو لوگ قرآن کے معانی میں بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو اختلافات سے تنگ دل نہ ہونا چاہیے بلکہ ہر محقق کی تحقیق سے استفادہ کی کوشش کرنی چاہیے

علامہ فراہی ایک بڑے درجہ کے محقق تھے انہوں نے اپنی تفسیروں میں تحقیق کا ایک خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو دوسرے مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس اسلوب خاص میں سے انہوں نے جو مطالب اخذ کئے ہیں، اور آیات کے جو معانی متعین کئے ہیں ان میں اختلاف کی ویسی ہی گنجایش ہے جیسی دوسرے مفسرین کے نتائج تحقیق میں ہے۔ لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ناظر کے زاویہ نظر کو وسیع کرتا ہے، اور قرآن مجید کے معانی و مطالب سمجھنے کے لیے تحقیق و تفحص اور مواد علمی کے وسیع تر میدانوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ کوئی شخص ان کے نتائج تحقیق سے کلی اتفاق نہ رکھتا ہو، مگر وہ ان کی تحقیقات میں ایسے بیش قیمت علمی فوائد پاتا ہے جن سے کوئی طالب العلم بے نیاز نہیں ہو سکتا ان کی تصنیفات اور ان کے مضامین کی اشاعت فی الواقع ایک بڑی علمی خدمت ہے جس کا بیڑا ان کے تلامذہ نے اٹھایا ہے اور ہم تشنگان معارف قرآنی کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس سے ضرور استفادہ کریں۔

دیوان غالب مجلد ہمارے پاس حیدرآباد کے محبوبیہ کارخانہ جلد سازی نے دیوان غالب کی ایک جلد نمونہ کے طور پر بھیجی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ ہندوستانی کارخانہ اپنے کام کی نفاست میں کسی طرح انگریزی کارخانوں سے کم نہیں ہے گذشتہ ایک سال میں اس نے تقریباً، ۳ ہزار جلدیں تیار کی ہیں جن پر سرکاری محکموں اور معززین نے اظہار و اطمینان کیا ہے۔ مزید براں یہ معلوم کر کے ہم کو خوشی ہوئی کہ اس کارخانہ میں وظائف دیکر لڑکوں کو فن جلد سازی کی تعلیم دیجاتی ہے اور اس کام میں کسی قسم کا نسلی و قومی امتیاز نہیں کیا جاتا کارخانہ میں ایک شعبہ تحقیق بھی ہے جس نے تین چار مفید چیزیں ایجاد کی ہیں۔ ایسے صنعتی ادارے اس کے مستحق ہیں کہ اہل ملک ان کی ہمت افزائی کریں۔ ہندوستان میں اب مجلد کتابیں شائع کرنے کا ذوق ترقی کر رہا ہے۔ جو مصنفین اور ناشرین اپنی کتابوں کی تجلید کرانا چاہتے ہوں ان سے ہم سفارش کرتے ہیں کہ انگریزی کارخانوں کے بجائے اس ہندستانی کارخانے کی طرف توجہ کریں

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابو الاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء

کی ہو بہو صفحہ بہ صفحہ جامع مع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امیرکن بلاک (۷۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن (مد ظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ سنہ ۱۳۵۵ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت بیس روپے بعد طبع پچیس روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادرۂ روزگار کتابوں کے لیے

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)